**تجلیات قتیل** :- مرتبہ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، قیمت ۵ روپئے، پتہ :- ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، دانشکدہ، ملکی محلہ آرہ۔

حضرت سید شاہ محمد قائم رضوی قتیل سجادہ نشین آستانہ چشتیہ نظامیہ داناپور سلسلۂ ناسخ کے ایک کامل الفن اور کہنہ مشق شاعر ہیں، جن کے تلامذہ کی تعداد سو سے متجاوز ہوگی، ان کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں دسترس ہے اور دونوں میں صاحب دیوان ہیں، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق صدر شعبۂ اردو و فارسی جین کالج آرہ نے قتیل کا اردو دیوان "تجلیات قتیل" مرتب کرکے شائع کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ یہ دیوان ۲۷۵ منتخب غزلوں پر مشتمل تھا، اور کوئی غزل ۹ یا ۱۲ اشعار سے کم کی نہ تھی، میں نے طباعت کی مشکلات کے پیش نظر اختصار و انتخاب کو ملحوظ رکھا، ڈاکٹر صاحب خود بھی صاحب ذوق ادیب و شاعر ہیں، اس لئے انتخاب خوش سلیقگی سے کیا گیا ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس میں داناپور کے تصوف و عرفان اور علم و ادب کے گہوارہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے، اور قتیل کے کلام کی مختصر خصوصیات بھی دکھائی ہیں، مقدمہ دلکش ادیبانہ طرز نگارش کا نمونہ ہے اگرچہ بہت مختصر ہے، اصل کلام اپنے رنگ میں اچھا ہے، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق نے اس ادبی سرمایہ کو محفوظ کرکے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔

**معلم القواعد والاعراب** (جزو اول) :- مرتبہ مولانا محمد مبین صاحب ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۶، قیمت تین روپئے پچاس پیسے، ناشر :- مکتبہ دار القلم کوپا گنج، اعظم گڈھ۔

مصنف ایک تجربہ کار معلم ہیں، یہ کتاب ان کے برسوں کے مطالعہ و تجربہ کا نتیجہ ہے، اس میں نحوی قاعدے تو مجملاً بیان کئے گئے ہیں مگر مثالوں اور ترکیبوں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، اور یہی اس کتاب کی اصل خصوصیت ہے، پہلے جملہ اسمیہ کا ذکر ہے، جیسے مبتدا و خبر کے ضروری قواعد بیان کئے ہیں، پھر جملہ فعلیہ میں مختلف افعال، فاعل، مفعول اور دوسرے منصوبات وغیرہ کے قاعدے، مثالیں اور جملوں کی ترکیب نحوی کی گئی ہے، آخر میں ادوات کا ذکر ہے، مگر اس میں صرف حروف استفہام اور اذ کے قاعدے ہی تحریر کئے گئے ہیں، غالباً باقی حروف کا ذکر دوسرے حصہ میں ہوگا، کتاب مبتدی طلبہ کے لئے کارآمد ہے۔

«ض»

جلد ۱۳۵۔ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۵ء عدد ۲

## مضامین



## مقالات



## ایک ضروری اعلان

معارف کا زر سالانہ جنوری ۱۹۸۵ء سے تیس روپیے کر دیا گیا ہے، اس لئے براہ کرم آپ تیس روپیے زر سالانہ روانہ فرمائیں، پرانے خریداروں سے گذارش ہے کہ اگر ان کا چندہ ختم ہوگیا ہو تو وہ بھی تیس ۳۰ روپیے بھیجیں اور رسید کے ساتھ اپنے خریداری نمبر کا حوالہ بھی دیں۔

"منیجر"

# شذرات

گذشتہ مہینہ معارف کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اپنی سیاسی زندگی میں جامد اور منجمد رہیں، یا متحرک ہوں۔ وہ متحرک ہونے کے لیے کیا کریں۔

یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں مسلمانوں نے آج ہی کی طرح سیاسی حیثیت سے اپنی بے بسی اور لاچارگی محسوس کی تھی، تو اس وقت بجنور کے سہ روزہ اخبار مدینہ نے اپنا ایک صفحہ "مسلمان کیا کریں" کے عنوان سے ملک کے مسلمان مشاہیر اور اکابر سے مضامین لکھوانے کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد مسلم لیگ طوفان کی طرح امڈی اور سیلاب کی طرح مسلمانوں کے جذبات کو بہالے گئی، ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ پاکستان کا بننا صحیح یا غلط ہوا، توجہ اس طرف دلانی ہے کہ یہی مسلم لیگ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں بالکل نیم جان بلکہ مردہ ہوگئی، پاکستان میں اس کے اسباب پر تو وہاں کے لوگ غور کریں، لیکن ہندوستان میں اس کے بے عمل ہوجانے پر غور کیا جاسکتا ہے، تقسیم ہند کے بعد اعصابی اور نفسیاتی جنگ کے ذریعہ سے اس پر زہریلے قسم کی فرقہ دارانہ کے اتنے الزامات رکھے گئے کہ اس کے بچے کھچے رہنما جو پاکستان نہ جاسکے، گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے، اس کے علاوہ عام مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ تقسیم کی تلخیوں کے بعد ان کے ازسرنو سیاسی خیالات و جذبات کیا ہوں۔ ان کی اکثریت اس کی خواہاں تھی کہ اس کو بدلے ہوئے حالات میں بدل کر رہنا ہے کس طرح؟ ان کو اپنے گونگے جذبات کی خبر نہ ہوسکی، اور نہ کوئی ان کی صحیح رہنمائی کرسکا۔

---

برطانوی حکومت کے عہد میں مرکز اور صوبوں کی قانون ساز مجلسوں میں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ سے انکے اراکین منتخب ہوتے تھے، مسلمان اراکین مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہوکر وہاں پہونچ جاتے تو ان میں انکی آواز



مسلمانوں کی آواز سمجھی جاتی تھی، مگر اب مخلوط انتخاب میں جو مسلمان اراکین ان قانون ساز ایوانوں میں منتخب ہوتے ہیں، وہ ہندو مسلمان دونوں کے ووٹوں سے ہوتے ہیں، اسلئے وہ تنہا مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہوتے اس لیے وہاں پہونچ کر مسلمانوں کے سیاسی جذبات کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہتے ہیں، پھر وہ جس پارٹی کے ٹکٹ پر چنے جاتے ہیں، اس کے زیادہ وفادار رہتے ہیں، اس وفاداری میں ان کو جو ذاتی فوائد پہونچ جاتے ہیں، اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

---

مسلمانوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ گذشتہ ۳۰ سال میں اس ملک میں ان کی کوئی نمایاں سیاسی حیثیت نہیں رہی، ان کی کہیں موثر آواز سنائی نہیں دیتی، بلوے فساد کے موقع پر ان کی چیخ پکار اور آہ و بکا سے ملک ضرور گونج اٹھتا ہے، مگر ان میں وہی مجرم قرار دیے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں انکے جانی اور مالی نقصانات زیادہ ہوتے ہیں، اور انکی تلافی بھی نہیں ہوتی، ان کی کوئی طاقتور تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے ان خونریز فسادات کی صحیح صورت حال ملک کے سامنے نہیں آتی۔

---

اس وقت ملک میں مسلمانوں کی تنظیموں کی کمی نہیں لیکن وہ موثر نہیں ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ جس پر مسلمانوں کا اعتماد ہے، اس پر حکومت اور اکثریتی فرقہ کا اعتماد نہیں ہے، اور جس کو حکومت یا اکثریتی فرقہ قابل اعتبار سمجھتا ہے، اس سے عام مسلمان خوش نہیں، کوئی ایسی تنظیم نہیں جس پر دونوں کا اعتماد ہو، مسلمانوں کے گونگے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ اچھے ہندوستانی بن کر ملک کے قومی بہاؤ میں ساتھ دینا چاہتے ہیں مگر جب غلط قسم کے راشٹریہ کرن کی آواز انکے کانوں میں پڑتی ہے، تو پھر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ قومی بہاؤ ان سے دور چلا جاتا ہے یا وہ قومی بہاؤ سے دور ہوجاتے ہیں، ان کی دلی خواہش ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر قومی بہاؤ کا ساتھ دیں، مگر وہ اپنے مذہبی وجود اور تمدنی ہستی کو ختم کر دینا بھی پسند نہیں کرتے، یہ قطعی ضروری نہیں کہ قومی بہاؤ کا ساتھ دینے کیلئے دین دھرم کی تفریق مٹادی جائے، ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان بن کر وطن کے فدائی اور شیدائی صحیح معنوں میں ہوسکتے ہیں۔

---

ملک کے بدخواہ انتہا پسندوں کے نعرے جو بھی ہوں، مسلمان اپنے اندرونی جذبات کے مطابق اپنے اور اپنے ملکی مفاد کی خاطر وہ اچھے مسلمان اور اچھے ہندوستانی بن کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں، اس کے لئے ان کی فطری خواہش ہوگی کہ ان کی کوئی ملک گیر تنظیم ہو، لیکن جب تک ایسی تنظیم معرض وجود میں نہیں آتی، تو وہ مقامی اور شہری پیمانہ پر ایک ایسی تنظیم کی تشکیل کر سکتے ہیں، جس پر مسلمانوں کا پورا اعتماد ہو، اور ہندوؤں کا اس پر پورا اعتماد نہ ہو تو کم از کم اس سے مشکوک اور بدظن بھی نہ ہوں، ایسی تنظیم کا تجربہ کرنا زیادہ مشکل نہیں، ارسطو اور افلاطون نے شہری ریاستوں ہی میں جمہوریت کا تجربہ کیا تھا، جو آگے چل کر عالمگیر ہو گئی، مسلمانوں کی ایسی شہری تنظیمیں کامیاب ہو گئیں، تو کیا، عجب کہ یہ ملک گیر ہو جائیں۔

---

خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور منفردانہ زندگی کا نام اسلام نہیں، اسلام جد و جہد، سعی و عمل اور حرکت و سرگرمی کا نام ہے، وہ موت نہیں، حیات ہے، وہ سرتاپا مجاہدہ ہے، لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں، بلکہ میدان میں نکل کر، یہ عمل ہے، ترک عمل نہیں ہے، یہ ادائے واجبات ہے، عدم واجبات نہیں، ادائے فرض ہے، احتراز فرض نہیں۔

---

ان سطروں کے لکھتے وقت پروفیسر محمد مجیب سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، ان کی وفات ایک ایثار پسند محب وطن، ایک بہت ہی قابل قدر مصنف، اردو زبان و ادب کے ایک بہت ہی لائق عزت اور جان نثار اہل قلم جامعہ ملیہ کے ایک بہت ہی شفیق اور محبوب وائس چانسلر، ایک بہت اچھے انسان، علم دوست اور علم پرور کی رحلت ہے، سردست ان کے لئے دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائے، آمین! آیندہ اشاعت میں انشاء اللہ خاکسار کے قلم سے ایک تاثراتی مضمون ہوگا۔



# مقالات

## سرسید احمد خاں اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسر اقتدار ہوتے ہی، عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر، تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث و مناظرہ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پیہم حملے کر کے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہو گئی تھیں جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے، ان الجھنوں کو دور کرنے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لیے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے ان میں سرسید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھ کر لوگوں کو

سخت حیرت ہوئی کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عیسائی مشنریوں کی مدد کے لیے تیار کی گئی تھی، چنانچہ سرولیم میور لکھتے ہیں کہ

"پادری فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثوں میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے، جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں۔"

(خطبات احمدیہ ص ۱۱)

سرولیم میور اضلاع شمال مغرب (یوپی) کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سرسید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کاز کورٹ) کے منصب پر تھے، سرولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ وہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ چکے تھے، جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انھوں نے "احکام طعام اہل کتاب" لکھی جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی اسلیے وہ "کرسٹان" سمجھے جانے لگے تھے، اور علماء کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہوچکا تھا، لیکن سرولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سرولیم میور کو بری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیئے وہ بے چین ہوگئے، وہ اکثر اس کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ "اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں" (حیات جاوید حصۂ دوم ص ۱۲۰)، ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہوچکے تھے،



اور سرولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہ تھیں، اس لئے سرسید کو ولایت جانے کا خیال ہوا، چنانچہ وہ بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے باوجود یورپ گئے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈالدیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی پرواہ نہیں کی، سیاسی مصلحتوں کو نظرانداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لیے بھیجے جانے والے تھے، ان کے سرکاری وظیفہ کا مسئلہ درپیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا، اور وہ سرمیور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے لندن پہنچ گئے، انڈیا آفس کے کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ سیر و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ[12] اسیز (Essays) یعنی خطبے لکھکر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے، اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا (حیات جاوید ص ۱۱۰)

اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں، انگلستان سے مولوی سید مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ

"ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلادیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھکر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھدی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہوجائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہوجاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگائی شروع کردی ہیں،" (حیات جاوید ص ۱۲۱)

ایک اور خط میں یہ لکھتے ہیں کہ "مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز

مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے، آپ اس خط کے پہنچنے پر..... کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔..... ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور لکھدیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیجدو ..... کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہوگیا ہے، خدا مدد کرے۔"

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ "میں روز و شب تحریر کتاب میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے۔ ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کردیا، روپیہ کہاں سے آئے گا۔" (حیات جاوید ص ۱۲۱)

خطبات احمدیہ کی جلد اول تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں ۴ ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپیہ ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کرکے روانہ کئے اور کچھ انھوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ تھا، اور وہ نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرۂ حامد و محمود کا انتقال ہوگیا، کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکرمند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا، ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (ایضاً ص ۱۲۲)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصۂ اول کی تکمیل پر، ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتے ہیں

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب



لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔" (حیات جاوید ص ۱۲۳)

**مستشرقین کی تردید میں خطبات احمدیہ کا امتیاز**

لاہور ڈیونٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ کہا کہ

"ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے، ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جاکر ان ہی کی زبان میں وعظ کہتے، اور ان ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برسوں میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔" (ایضاً ص ۱۲۲)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے دوستانہ اور غیر متعصبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لئے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی، اور تحقیقی جوابات دیئے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے، ان کے خیال میں اس کتاب سے "مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہیئے کہ اس کتاب کو

غور سے پڑھیں، دین محمدی انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول دین ہے، اور وہ
اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگ دلی
کی اس میں خیال کی جاتی ہے، لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں،
جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے
خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور
کی کتاب لائف آف محمدؐ کی تحریروں کی مخالفت کی ہے، اور خوب چٹکیاں لی ہیں، اور
میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور
کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔" (حیات جاوید ص ۱۲۶)

سر ولیم میور سے پہلے مستشرقین، اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر انداز تحقیق صرف کر رہے
تھے، لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات جدید
دور کی شائستگی تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل
کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا (خطبات احمدیہ ف۲۳) یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا، جس میں غیر مستند
روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب یابس واقعات سے جن کے بیان کرنے والے خواہ
کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں مدد لی گئی تھی، سر سید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی
کتابوں اور ان کی روایتوں کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین
نے مقرر کئے ہیں، اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے، ان کی تشریح
کی ہے، جس سے سر ولیم میور کے استدلال کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، انھوں نے لکھا
ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو۔
اور مسلمانوں کے اعمال و کردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں، ان کے جواب دہ خود



مسلمان ہیں نہ کہ اسلام، انھوں نے سر ولیم میور کے مغالطوں کا نہایت معقول دلائل اور دل نشین
پیرایہ میں جواب دیا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۹۲)

اس کتاب کی ایک خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم انداز بیان اور منصفانہ طریق استدلال
ہے، وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی شرافت، نرم خوئی، اور ہموار لب و لہجہ کو برقرار
رکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ ہی میں چند مستشرقین کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"(میں) ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مؤرخوں کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں
رہ سکتا جنھوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے بلکہ متعصب
اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض
مقامات میں انھوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کئے ہیں، لیکن صاف معلوم
ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ
نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۰)

انھوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی حمایت میں نقل کیے ہیں،

خطبات احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے
بھی حیات جاوید (ص ۱۹۰) میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو
اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں بعض علمائے محققین
نے بھی وہی لکھا ہے، جس کو سر سید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج کے واقعہ کو جیسا کہ بعض
صحابہ کا مسلک ہے، انھوں نے رویا پر محمول کیا ہے، اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی
اسی رویا میں داخل کیا ہے یا ایک آدھ بات اور ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک

سرسید مرحوم نے وہ بحثیں نہ کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کئے گئے، خطبات احمدیہ میں انھوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی، اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارے میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی۔

**مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات**

سرسید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے ہیں، ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہیں، انھوں نے اپنی اس کتاب میں سر ولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جابجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو، حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل علیہما السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت سے بھی انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسماعیلؑ سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ توراۃ میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، ان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مراد نہیں ہے۔

سرسید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے توراۃ کی پیشین گوئی نقل کی ہے، لیکن ہم یہاں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۵۸ء کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں ا۔

"اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا



بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے، تو اس کی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا ٥ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے، ٥ تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھکر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کرکے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی، اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی ٥ اور جب مشک کا پانی ختم ہوگیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈالدیا ٥ اور آپ اس کے مقابل پر ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی، اور چلا چلا کر رونے لگی ٥ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے، ٥ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ٥ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جاکر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑا ہوا، اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی ٥ (پیدائش باب ۲۱ درس ۹-۲۱)

مذکورہ بالا پیشین گوئی واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دے رہی ہے، اسی لئے، سر ولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے، اور

یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے نہ تھے، حضرت اسمٰعیلؑ یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی، اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں۔

**فاران** "سرسید مرحوم نے سر ولیم میور کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ :-

عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگڈنی بنادرم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے، اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے، اور وہ عبارت یہ ہے "وسکن فی بریۃ فاران (الحجاز) واخذت لہ امہ امراۃ من ارض مصر، (عربی ترجمہ توراۃ سامری) (خطبات احمدیہ - ص ۱۱۲ -)

اس کے بعد وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ عموماً عیسائی مؤرخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے، تسلیم نہیں کرتے اسکے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کرلیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے، بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا مراد ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۲)

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعۂ زمین مراد ہے، جو بیر شبع کی شمالی حد سے لیکر کوہ سینا تک چلا گیا ہے، اور فاران کے نام سے مشہور ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے، اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علٰحدہ علٰحدہ ناموں سے معروف ہیں، مثلاً شور، بیر شبع، اثیام، سین، زین، عیدام وغیرہ، لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں۔

"اس بیان کی تردید کے لئے ..... اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ..... توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کردیں کیونکہ ان سے صاف منکشف ہوجاتا ہے کہ فاران خود ایک



جداگانہ بیابان ہے، اور گرد و نواح کے بیابان اس میں شامل نہیں۔

(الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کرکے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا۔ (گنتی باب ۱۰ ورس ۱۲) اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا، اور بیابان فاران میں مقام کیا، قرار واقعی ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علٰحدہ اور جداگانہ بیابان تھے،

(ب) اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے ٥ (پیدائش باب ۱۴ ورس ۵ تا ۶) پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علٰحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اُس ورس کی عبارت مہمل ہوجاتی ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۵)

مزید وضاحت کے لئے وہ توراۃ سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں :-

(ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ٥ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جو ان کے ہاں کا رئیس ہو ٥ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشتِ فاران سے ایسے آدمی روانہ کئے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (گنتی باب ۱۳ ورس ۱ تا ۳)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی، اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (گنتی باب ۱۳ ورس ۲۶)

(ھ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے

جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں (فارسی ترجمہ میں:- باہزار ہزاراں) قدسیوں میں سے آیا اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا باب ۳۳ ورس ۲)

(و) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (حبقوق باب ۳ ورس ۲)

(ز) اور وہ مدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لیکر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (سلاطین اول باب ۱۱ ورس ۱۸)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک کنواں بیر شبع کھودا تھا، اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سرسید مرحوم نے اس قول کی تردید میں (گنتی باب ۱۳ ورس ۲۶ کے علاوہ) تورات کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:۔

"اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی قادس پہنچے اور عمالیقوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا۔ (پیدائش باب ۱۴ ورس ۷، ۸)

وہ لکھتے ہیں کہ (مذکورۂ بالا اقتباس میں) جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیئے جائیں ورس مذکورۂ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ (ایضاً ص ۱۱۶)

فاران کے بارے میں تیسری بات مسٹر روپر وغیرہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے، جو فاران کے نام سے مشہور ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے، جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ صحرائے بیر سبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آکر ٹھہرے تھے، اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ



حضرت اسمٰعیلؑ وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے، جس کا ذکر تکوین (پیدائش) میں آیا ہے، سرسید مرحوم نے مذکورۂ بالا رائے کی بھی تردید کی ہے، اور لکھا ہے، کہ "کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اسمٰعیلؑ نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی، اور رنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسمٰعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں، اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں، وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں، مصنف موصوف نے سفر تکوین، (پیدائش) باب ۲۵ ورس ۱۸ پر جس کی یہ عبارت ہے، "اور اسکی اولاد حویلاہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے، جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی" سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ "خدائے تعالیٰ کے وعدے اسی میں ایفا ہو گئے تھے، جبکہ اسمٰعیلیوں کی آبادی سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی"، اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے فرات پر قرار دیا ہے، اصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ ورس ۲۹ میں مذکور ہے، نواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۱ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقع ہے، اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنے سے ہو سکتی ہے، جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے، واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیئے جن کا نقشہ ریورنڈ کارٹرٹ پی کیرے ایم اے نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں "شور" کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں صحرائے ایتام واقع ہے، اور یہ قطعی غلطی ہے، کیونکہ صحرائے "شور" سے توریت مقدس میں مراد تمام وہ وسیع میدان ہے، جو شام سے لیکر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے"۔ اس کے بعد وہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

"اصل عربی توریت میں صرف ۲ نام ہیں شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں اُن دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسیریا ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسماعیل اس وسیع قطعے میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے، ہمارے اس نتیجے کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے، اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب غزلیت کرے، اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے جو کہ سامنے مصر کے ہے، اگر تو اسیریا کی طرف دانہ ہو" یعنی مصر کے سامنے ہے، اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچو۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۹)

انھوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں (۱۲۲) سینا سے بنی اسرائیل کا سفر مشرق کی جانب تھا، جس میں انھوں نے پہلی منزل تبعیرہ (گنتی باب ۱۱ درس ۳) میں کی پھر قبروت ہتاوہ آئے، اور وہاں سے حصروت پہنچے (گنتی باب ۱۱ درس ۳۴، ۳۵) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے، (باب ۱۲ درس ۱۶) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے، جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے، اس لیے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا سفر شمالی اور مشرقی سمت میں تھا یعنی قادیش کی طرف (باب ۱۳ درس ۲۶) اس لئے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰؑ نے کیا ہے، سینا کے مغربی جانب نہیں ہو سکتا، بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کے عیسائی علما نے پانچ مختلف راستے بنائے ہیں، ہر جگہ اختلاف کی صورت میں۔

"اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا ہے، جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے، اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مؤرخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰؑ کے کوچ کے تمام بیان کی



تطبیق ہو جاتی ہے، اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔" (خطبات احمدیہ ص ۱۲۵)

توریت (پیدائش باب ۲۱ درس ۱۴۔۱۵) سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہؑ بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں، اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو دیا تھا ان کے پاس تھا، اور وہی ختم ہو گیا تھا، سرسید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں، اوّل اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیمؑ نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا، اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصۂ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا، حضرت ہاجرہؑ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے بنائے ہوئے کنوئیں نہیں تھے بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کیے ہوئے بھی موجود تھے، (پیدائش باب ۲۶ درس ۱۸ تا ۲۲) سرسید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:

"مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہؑ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں، مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیر شبع کے اردگرد ..... قومیں ..... لڑاکا اور جھگڑالو تھیں، ..... اس لئے حضرت ہاجرہؑ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا جہاں ان کو امن ملے اور آسایش سے رہ سکیں ..... لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا ..... جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے، تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا ..... خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو ..... چھپا دیتے تھے، ..... جس وقت حضرت ہاجرہؑ مضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں، تو ان کو وہ چشمہ مل گیا توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، جہاں لکھا ہے،" پھر خدا نے اس کی آنکھیں

اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا، اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔" (پیدائش باب ۲۱ ورس ۱۹) ... بہر حال حضرت ہاجرہ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا، جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب و جوار میں آکر آباد ہوئے۔" (خطبات احمدیہ ص ۱۲۹)

سر سید مرحوم، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد در اولاد کی مختلف نسلوں اور انکی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ "تمام تلاش اور تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی، اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار مین (حویلاہ) سے لیکر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں، اور اس طرح یہ حضرت موسیٰؑ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے، جو سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ میں مندرج ہے، کہ "وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے، جو سامنے مصر کے ہے، جب تو اسیریا کو روانہ ہو۔"

(خطبات احمدیہ ص ۱۴۱) (باقی)

---

## سلسلۂ مقالات سلیمان

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے متعدد بلند پایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی، مذہبی، فقہی و تاریخی، ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے، ان تمام مضامین کو فن وار کتابی صورت میں تین ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیا جا چکا ہے، پہلی جلد تمامتر ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کے مضامین پر، دوسری جلد خالص علمی و تحقیقی مضامین پر، تیسری جلد قرآنی و مذہبی مضامین پر مشتمل ہے، تیسری جلد میں علامہ کے وہ معرکۃ الآرا مضامین بھی ہیں، جو انھوں نے یورپ اور امریکہ کے بعض سرکردہ مستشرقین کے جوابات میں لکھے تھے، اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے،

قیمت علی الترتیب

۲۶ روپے - ۲۳ روپے - ۲۳ روپے - بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں۔ (منیجر)



# حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ

انکی

# سیرۃ النبیؐ میں انشا پردازی کی حیثیت سے

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

**تمہید** اس خاکسار کو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہ العزیز کے ادنیٰ شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے، اس تعلق کی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت استاذی المحترم سب سے اچھے ماہر قرآنیات، سب سے اچھے ماہر حدیث، سب سے اچھے ماہر علم کلام، سب سے اچھے سیرت نگار، سب سے اچھے مورخ اور سب سے اچھے انشا پرداز تھے، آپ کو اختیار ہے کہ آپ اس سے اختلاف کریں، مگر آپ کو اس کا بھی حق نہیں کہ آپ اس خاکسار کو اپنی یہ رائے قائم کرنے کے حق سے محروم کر دیں، آپ کو اپنی پسند ہے تو اس خاکسار کو بھی اپنی پسند ہے۔

یہ موقع تو نہیں کہ اس دعوی کو ثابت کیا جائے کہ وہ علامہ شبلیؒ کے بعد کس طرح سب سے اچھے ماہر قرآنیات، ماہر حدیث، ماہر علم کلام، سیرت نگار اور مورخ تھے، مگر یہاں پر ان کی انشا پردازی سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا، اس سلسلہ میں ان کا یہ جوہر ان کی مشہور تصنیف سیرۃ النبیؐ میں کیسے چمکتا دکھائی دیتا ہے، اس کی طرف خاص توجہ دلانی ہے،

جس کسی کو ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اس نے ان کو طہارت، شرافت، تمکنت، عظمت، سنجیدگی، ادب، وقار کا پیکر پایا، ان ہی اوصاف کی بوقلمونی ان کی تحریروں اور کتابوں میں نظر آگئی،

ان کی تصنیف ارض القرآن میں سنجیدگی ان کے قلم کو چومتی نظر آئے گی، ان کی کتاب "سیرت عائشہ رضہ" میں ادب و احترام نچھاور ہوتا دکھائی دے گا، ان کی "عرب و ہند کے تعلقات" اور "خیام" میں تمکنت انکے قلم سے ہم آغوش دکھائی دے گی، اور پھر ان کی شہرۂ آفاق "سیرۃ النبیؐ" میں عظمت اور وقار ہر سطر میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، وہ اپنی ان ہی خصوصیات کی بنا پر کبھی اللہ تبارک تعالےٰ کی ذات پاک کا جلال، کبھی اس کی صفات کاملہ کا جمال، کبھی اس کے مرغ و ماہی، اور کبھی عبدوں کی مجبور و محکوم دنیا میں اس کی بادشاہی دکھاتے رہے، کبھی رسول اللہ صلعم کی سیرت مقدسہ کے گلشن میں نسیم نو بہاری بن کر اس کے گل و سرو و صنوبر سمیٹتے رہے، کبھی تفسیر کے دریا میں مثل موج ابھر کر، کبھی حدیث کے دریا کے ساحل سے گذر کر، کبھی تاریخ کے دریا کے سینے میں اتر کر، کبھی ملی سیاست کے جذبات کا تلاطم ابھار کر، کبھی اپنے محبوب معاصروں کی موت پر اپنے آنسوؤں کا سیلاب بہا کر، اور کبھی انداز بیان کے کوثر و تسنیم کو رواں کر کے اپنے علم و قلم کے مقام خودی کو فاش تر کرتے رہے،

سیرۃ النبی جلد اوّل و دوم تو علامہ شبلی نعمانیؒ کی لکھی ہوئی ہیں، لیکن سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد سید صاحب کی اپنی تصنیف ہے، گو اس کے ۸۷۰ صفحوں میں ۸۳ صفحے مولانا عبد الباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں، اسکا موضوع معجزات ہے اس میں معجزات کے امکانات، تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ، تاثیرات نفسانیہ، مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رویا، مشاہدات، مسموعات اسرا و رویائے معراج، معراج کے اسرار، علامات اور انعامات، شق القمر، اور شق صدر وغیرہ جیسے غوامض پر مباحث ہیں، ان میں کبھی اشاعرہ، اور کبھی معتزلہ کے نقطۂ ہائے نظر پیش کئے گئے ہیں، کہیں ابن رشد، ابن تیمیہ، یعقوب کندی اور فارابی کی تصانیف کی ورق گردانی کی گئی ہے، ان تمام مباحث کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث پر رکھی گئی ہے، یہ موضوع آسان نہ تھا، خشک، مشکل اور سنگلاخ تھا، اس کے غامض مباحث میں اغلاق، اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا خیال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں



سید صاحب نے کچھ ایسا طاقت ور انداز بیان اختیار کیا کہ جو چیزیں معلوم تھیں، وہ از سر نو معلوم ہوتی نظر آئیں، اور جو چیزیں معلوم نہیں تھیں، ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خیال کے خارستان میں لالہ زار دکھائی دے رہا ہے، اور ظنیات کے ریگستان میں ایک نئے قسم کا گلزار آباد ہو رہا ہے، شکوک و شبہات کی تاریکی میں ایمان کی مہتابی چھل رہی ہے، پوری کتاب ایک عاشق اسلام کے بے قرار دل، ایک پر جوش متکلم کے مستحکم دلائل اور ایک رمز شناس عالم کی گہری نگاہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، جس میں قرآن مجید کی آیتوں کے ہیروں کی کانکنی بھی کی گئی ہے، اور حدیث کے خزانے سے زمرد اور یاقوت بھی بکھیرے گئے ہیں، اس کو پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج کمال پر پہونچ رہی تھی، جس کو قلمبند کرنے میں ان کے قلم کی شگفتگی، تحریر کی روانی، زبان کی بے تکلفی، طرز استدلال کی ندرت، فصاحت کی دل نشینی اور بلاغت کی دل آویزی انکا پورا ساتھ دے رہی تھی اور انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ لیلےٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری لکھنے یا پھول کو زیب چمن بنا کر اس کی شمیم انگیزی کرنے یا بوئے گل کو نسیم سحری سے پھیلانے، حسینوں کی مشکیں زلفوں کی شامہ نوازی اور عنبریں بانہوں کی مرقع آرائی کرنے میں تو انشاپردازی کا جوہر دکھانا بہت آسان ہے، لیکن موضوع کی سنگلاخی کے ساتھ افکار و مباحث کا قصر شیریں تعمیر کر کے اس کے اندر سے زبان کی جوئے شیر بہانا بہت مشکل ہے، اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایہ بیان مل رہا تھا، جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غوامض اور دقایق کو شگفتہ اور شستہ طرز ادا میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی تمہید ہی پوری ادبی شان سے لکھی گئی ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں۔

"سیرت نبویؐ کا یہ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے، جن کا تعلق اس عالم سے ہے، جو ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی

قوانین کے حدود سے باہر ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں، تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے۔ وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے،

آسمانہاست درولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں

(جلد ۳ صفحہ ۱)

تحریر کی یہ روانی رکتی نہیں اور بہتی چلی جاتی ہے، اس کے فوراً ہی بعد رقمطراز ہیں۔

"جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے، تو صبح کا ظہور ہوتا ہے، اور آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے، تو موسم بدلتا ہے، اور بہار نبوت رونق افزا ہوتی ہے" (ایضاً ج ۳ ص ۲)

کس طرح ؛ اس کو متکلمانہ رنگ مین اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

"اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کے رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں، جن میں تغیر راہ نہیں پاتا، انبیاء و رسل اپنے، اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہو جاتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوئے ہیں، اور اللہ کے عجیب خوارق ظہور پذیر ہوئے ہیں" (ایضاً جلد ۳ صفحہ ۲)



اس متکلمانہ رنگ مین کچھ فلسفیانہ تمکنت یہ لکھ کر پیدا کر دیتے ہیں کہ

"جس طرح ہمارا نفس اور ہماری روح یا ہمارے جسم کی پر اسرار مخفی قوت ہمارے کالبد خاکی پر حکمراں ہے، اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارہ پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روح اعظم اذن الٰہی سے ہمارے عالم جسمانی پر حکمراں ہو جاتی ہے، اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں، اس لئے وہ چشم زدن میں فرش زمیں سے عرش بریں تک عروج کر جاتی ہے" (ج ۳ ص ۲)

اس کے بعد نبی کی عظمت اور فضیلت کا احساس دلانے میں ان کی انشاپردازی کے جلوے اس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔

"سمندر اس کے ضرب سے تھم جاتا ہے، چاند اس کے اشارے پر ٹکڑے ہو جاتا ہے اسکے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں، اس کی انگلیوں سے پانی کی لہریں بہتی ہیں، اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں، اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر و بر، چاند اور بے جان بحکم الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں، مگر بایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے، اور اس سے یہ جو کچھ عجائب قدرت ظاہر ہوتے ہیں، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فضل ہوتا ہے اور اسی کی حیثیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں، یا اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں" (ایضاً جلد ۳ صفحہ ۳)

پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کی بے چارگی، مجبوری، محکومی اور لاعلمی کی مرقع آرائی اسطرح کرتے ہیں کہ اس میں منطقیانہ دلائل آگئے ہیں، اور تاریخی کوائف بھی۔

"لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص

ستارے فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں، پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں، ستارے چمکتے کیوں ہیں، شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے، چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں، تخم، درخت غذا، خون اور گوشت کیونکر بن جاتا ہے، اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے، کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیونکر ہوتا ہے، اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال و اعمال بحکم الٰہی کیوں کر صادر ہوتے ہیں، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پر اسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات و کیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات و سوانح غور سے پڑھیں، تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے وہ وہ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ وہ کچھ جانتے تھے، جو ہم نہیں جان سکتے، اور ان سے اعمال بھی صادر ہوتے تھے، جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے، یہ وہ تاریخی واقعات ہیں، جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سکندر، اور نپولین کے فتوحات، یا بودھ، موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے۔"

(سیرۃ النبیؐ (جلد ۳۔ صفحہ ۴-۱)

اس کتاب کا موضوع معجزات ہے، اس لیے اس میں فلسفیانہ مباحث بھی آگئے ہیں، مثلاً پیغمبروں کی خصوصیات میں ایک چیز خواب بھی ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں رویائے صالحہ یا رویائے صادقہ کہتے ہیں، عالم رویا کے عنوان سے اس کی بحث کی ابتدا انداز تحریر کی بلاغت کا لحاظ رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔

"رویا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے، علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے، کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں، جب وہ سو جاتا ہے، اور



اس کے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے، مگر چونکہ انسان عمیق اور پر سکون نیند سو جاتا ہے، اس لیے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالت خواب کا احساس نہیں ہوتا، لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی، تو اس کو اپنی گذشتہ سیر دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے" (جلد ۳ ص ۴۹۱)

سید صاحب اس کو فلسفہ قدیمہ کا فرسودہ خیال قرار دیتے ہیں، اور پھر جدید عہد ترقی میں اسکا جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس کو اس طرح آسان طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"جدید عہد ترقی میں سائیکلوجی اور نفسیات کے علما کا مشہور و معقول نظریہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات، ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں عالم خواب میں جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت اٹھ جاتی ہے، ان کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں" (ایضاً)

سید صاحب اس رویا کو خواب یا اوہام دماغی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر عرفائے روح کے نزدیک رویا کی کیا حقیقت ہے، اس کو اپنی نظر کی باریک بینی سے اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

عرفائے روح ..... کے نزدیک رویا کی حقیقت کچھ اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح سے عبارت ہے۔ روح جب تک جسم کے اندر ہے، اس کی جلوہ نمائی کے دو رخ ہیں، جسمانی و روحانی، اپنے جسمانی دروازہ سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادہ کی سطح پر رنگا رنگ نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں، یہ اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں، جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں، لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے، جہاں سے وہ روحانیت کے عالم کی سیر کر سکتی ہے جس قدر اس کا تعلق انس، دلبستگی، شیفتگی، اور مشغولیت عالم جسم سے زیادہ ہوگا اسی قدر وہ دوسرے

عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہوگی، حالت خواب میں روح کی ظاہری جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہوجاتی ہیں، اس لئے اس کو دوسری کھڑکی کی طرف جھانکنے کی فرصت مل جاتی ہے اور پھر روح کو جس قدر تعلقات خارجی سے بیگانگی زیادہ ہوجاتی ہے شہرستان ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے تمثیلی مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے، جو روحیں کہ اس عالم کی حجابی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار اور مقید نہیں ان کے لیے عالم بیداری بھی اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں، اسی کا نام مشاہدہ اور مکاشفہ ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۳۔ صفحہ ۳۶۲ - ۳۶۱)

یہ کیسا خشک موضوع تھا، لیکن سید صاحب نے اپنی تحریر کی روانی سے اس میں خشکی پیدا ہونے نہیں دی، فلسفیانہ مباحث میں اپنے انشا کا جوہر دکھا کر کیسی رنگینی پیدا کر دی ہے۔

سید صاحب نے معجزات کی بحث میں مادہ یعنی ہیولیٰ، حوادث بلا سبب موثر تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفعیہ اور تاثیرات نفسانیہ، وغیرہ جیسے فلسفیانہ مباحث کو سلیس اور فصیح زبان میں سمجھایا ہے، وہ ان حکمائے اسلام کے ادراک ہی کی طرح ہے، جو ان مباحث کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

معراج کے ذکر کی جو دل نشیں اور فصیح تمہید ہے، اس کو پڑھنے سے اس کی ساری کیفیات ذہن پر چھا جاتی ہیں، اور ان کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں فصاحت کی یہی تعریف ہے، کہ جو کچھ لکھا جائے، اس میں دل نشینی ہو، ذیل کی عبارت کو اسی حیثیت سے ملاحظہ کریں۔

"اولوالعزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ رتبہ حاصل ہوتا ہے، اور اس وقت شرائط رویت کے تمام مادی پردے ان کیلئے



منسوخ کر دیئے جاتے ہیں، قیود زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے سامنے آتے ہیں، اور وہ اس کے بعد نور کا حلۂ بہشتی پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں، اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض ربانی سے معمور اور غرق دریائے نور ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوت گاہ قدس میں بار پا کر قاب قوسین دو کمانوں کے فاصلہ سے بھی نزدیک تر ہوجاتے ہیں، اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمان خاص لے کر اسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آجاتے ہیں۔" (سیرۃ النبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۲)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج خصوصی کا ذکر ایسے ایجاز کے ساتھ کرتے ہیں جس میں سب کچھ کا احاطہ ہوگیا ہے۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سرور انبیا اور سید اولاد آدم تھے، اس لیے اس حظیرۂ قدس اور بارگاہ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی، جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہونچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربان بارگاہ کی حد نظر سے باہر تھا" (ایضاً۔ صفحہ ۳۹۵)

یہ تو سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی تھوڑی سی جھلکیاں تھیں، اب ذرا آگے بڑھ کر اور جلدوں کی طرف مائل ہوں۔

**سیرۃ النبیؐ جلد چہارم**

سیرۃ النبیؐ جلد سوم ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی، اس کے آٹھ سال کے بعد اس کی چوتھی جلد طبع ہوئی، جو ۰۰۰ صفحے پر مشتمل ہے، یعنی تیسری جلد سے بیس صفحے زیادہ ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید صاحب کے قلم کا مسافر پہلے سے زیادہ تیز اور سبک رو ہوگیا تھا، اس وقت ان کی عمر

۵۳ سال کی ہوچکی تھی، لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہوگیا تھا، اس لئے کہ

عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

یہ عشق رسول تھا جس کی رہ نوردی کرکے منزل تک پہونچنے میں ساری عمر گذار دی اور اسی عشق کی سرشاری بلکہ اس کی بسی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ان کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں، اس چوتھی جلد کا موضوع منصب نبوت ہے، اس میں پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے وقت دنیا اور خصوصاً عرب کی مذہبی اور اخلاقی حالت، خیر الامم بننے کی صلاحیت، تبلیغ نبوی کے اصول، اس کی کامیابی کے اسباب، اسلام کے عقائد میں ایمان کی مختلف قسمیں جزا سزا، دوزخ وجنت، قضا وقدر، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، وحی، وحی متلو، وحی غیر متلو، اجتہاد، حکمت، وغیرہ جیسے موضوعات پر مباحث ہیں، ان کو سمجھنے اور سمجھ کر سمجھانے کے لیے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلب گار ہے، سید صاحب نے اسی کو اختیار کرکے اس کو مطمئن کیا ہے، ان کو پڑھنے کے بعد قارئین غیر شعوری طور پر محسوس کریں گے کہ وہ افکار کی انجمن در انجمن سے گزر رہے ہیں، اور ان کے خیالات میں ارتعاش اور جذبات میں ہلچل پیدا ہورہی ہے، ان تمام باتوں کو قلمبند کرنے میں سید صاحب کو اس بات سے بڑی مدد ملی کہ ان کے ذہن کے دریچے اور روشندان ہر طرف کھلے رہے، ان کے خیالات کے قصر میں قرآن مجید کی شعاعیں اور احادیث کی کرنیں تو برابر داخل ہوتی رہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے قوموں کی تاریخوں سے جو عبرت وبصیرت حاصل کی، اس سے ان کے ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہی، پھر علم کلام فلسفہ اور نفسیات کی چاندنی بھی ان کے ذہن پر چھائی رہی، ان ہی ملے جلے اجزائے ترکیبی سے انکی تحریریں خود بخود ان کے قلم سے نکلتی رہیں، جن کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے قلم کے دل سے جو باتیں نکل رہی ہیں، وہ ان کے قارئین کے دلوں میں اتر رہی ہیں، یہ باتیں وہی محسوس کریں گے جو اسلام کے میخانے کے ساغر ومینا سے شغل رکھنے کا



ذوق رکھتے ہیں، اس قسم کے موضوع پر علماء بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں، جن کا یہ بڑا وصف تو ضرور رہا کہ وہ ایسے تمام مسائل کو اچھی طرح سمجھتے، لیکن ان کو سمجھانے میں ان کا قلم ان کا ساتھ نہیں دیتا، اس لئے ان کی تحریریں حواشی تعلیقات اور توضیحات کی محتاج ہوجاتیں، علامہ شبلیؒ کی تحریریں کا یہ اعجاز ہے کہ مسائل کتنے ہی دقیق اور پیچیدہ ہوں، ان کو سمجھ کر اپنے انداز بیان سے بہت ہی بہتر اور واضح طریقہ پر اپنے قارئین کو سمجھا دیتے، دبستان شبلیؒ کے ہی گل سر سبد سید صاحبؒ تھے اس لئے اس انداز بیان کی گل افشانی ان کی ہر تصنیف کی تحریروں میں ہے، سیرۃ النبیؐ کی اس جلد چہارم میں تو اس کے ہر صفحہ میں ہے۔

اس میں مجوسیوں کی مجوسیت، مزدکیوں کی مزدکیت، یہودیوں کی یہودیت، عیسائیوں کی عیسائیت، ہندوؤں کی ہندویت، بودھوں کی بودھ مت، زردشتیوں کے نور وظلمت، خیر، شر، نیکی اور بدی، اہرمن اور یزداں، کلیسا کی سفاکی، قباد، خسرو، نوشیرواں، قسطنطین جسٹینین اور یزدگرد وغیرہ کی حکمرانی کی تفصیلات آگئی ہیں، پھر ملائکہ، جنات کی حقیقت، بتوں کی پرستش، شیاطین، دوسری قوموں میں بھوت اور کہانت وغیرہ کے تخیلات، شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، سفاکی اور بے رحمی وغیرہ جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں، اس کے بعد یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اس ظلمت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خورشید نبوت کس طرح طلوع ہوا، اور کیسے یہ ظلمت شب کافور ہوگئی، اور کیسے اس نبوت کا نور سرزمین عرب کو منور کرکے دنیا کو روشن کرتا چلا گیا، یہ موضوعات نئے تو نہیں تھے، ان پر گذشتہ چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر سید صاحب نے ان ہی باتوں کو جس خاص انداز اور ذہن کو مطمئن کرنے والے پیرایہ میں لکھا ہے وہی اس کی نمایاں خوبیاں ہیں، قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ لوگوں سے ایسی باتیں کہو کہ جو ان کے دلوں میں اثر کریں، اس ہدایت

سید صاحب نے بہت کچھ سیکھا، اور سیکھ کر اپنی تحریروں کا سانچہ اس انداز میں ڈھالا کہ تمام لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا رہا، اس جلد میں زیادہ تر عقائد پر بحثیں ہیں، علماء، حکما، معتزلین اور صوفیائے کرام وغیرہ نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ان میں کچھ تو اپنی کج مج بیانی، کچھ اپنے عقیدوں کی غلو پسندی، اور کچھ دوسروں کے عقائد پر جارحانہ روش کی وجہ سے ان موضوعات کو موثر اور دل نشین نہیں بنا سکے، سید صاحب نے ان مباحث میں صرف قرآن مجید اور احادیث کو اپنے لئے شمع ہدایت بنایا ہے، اور ان ہی کی روشنی میں اپنے خیالات کی تصریح کی ہے، مگر ان کا طرز استدلال کچھ ایسا ہے کہ اس سے متقشف علماء، ذہین متکلمین، بیدار مغز معتزلین اور خمار توحید سے مخمور صوفیائے کرام کو بھی اختلاف نہ ہوگا، عام قارئین کے شکوک و شبہات کی ظلمت شب تو شب کا فور دکھائی دیگی، اس میں توحید کی جو بحث ہے، اس پر چودہ سو سال سے برابر بحث ہوتی آئی ہے، مگر اس کو اسلام نے جس طرح مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے پاک کیا، اس کو حسن ذہن رسا کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اس کا امتیازی وصف ہے، توحید کا مسئلہ جانا بوجھا ہوا ہے، لیکن اسی کو سید صاحب اپنے خاص حسن بیان کے سہارے اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"اس کی قدرت بے انتہا ہے، اس کی وسعت غیر محدود ہے، اس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، اس کے علم کے احاطے میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، ارمانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل وکرم



اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب ہے، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق ہے، اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کیلئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بیکسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکارتے ہیں، تو وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند، اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کردے، اور جب چاہے، پھر جلادے، اس کی محبت دنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے"

(سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۸۰۸)

کیسی ڈھلی ہوئی عبارت ہے، اس کا لطف وہی لے سکتے ہیں، جن کو قرآن مجید پر عبور ہے، اس کا ہر جملہ قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کا یا تو ترجمہ ہے، یا اس کی پرکیف تصریح ہے، قارئین اس تحریر کے طرز ادا کی لذت سے محظوظ ہونے کے علاوہ توحید کے نور سے اپنے ذہن کو منور کریں، اور ایک پیراگراف میں توحید کا جو نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا گیا ہے، وہ ایک صاحب کمال اہل قلم ہی کے بس کی بات ہو سکتی ہے۔

سید صاحب کے قلم کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں اپنی باوقار تحریر میں پر از تاثیر تقریر کی لذت پیدا کردیتے ہیں، اس کے نمونے اس چوتھی جلد میں جابجا ملیں گے، ایک نمونہ یہ

آپ بھی لذت آشنا ہوں ۔

"عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخری شریعت پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور زمزمۂ محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم النبیینؐ کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح، فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الٰہی کا اظہار، غرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی، اور یہ سب اس پر آشوب زمانے میں ہوتا رہا، جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باران کے روکنے میں صرف ہوئے۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۰۷)

یہ صرف لفظوں اور جملوں کا انبار نہیں، بلکہ ہر لفظ اور ہر فقرہ میں خیالات کی ایک دنیا آباد کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالٰی کے وجود پر اہم سے اہم فلسفیانہ، متکلمانہ اور معتزلانہ مباحث کئے گئے ہیں۔ لیکن حضرت سید صاحبؒ نے اس کے وجود کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس سے ہم آپ ذرا لطف لیں۔

"یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلمون زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، تغیر و انقلاب کا انتظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قوی، ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص قوی کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۴۶۴ - ۶۵)



اور ذرا اس سلسلہ میں ایک چھوٹے سے اقتباس سے اپنے ذہن کو روشن کر لیں۔

"یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار ہو جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سفید ہے۔" (ایضاً ۔ ۴۶۵)

ان باتوں کی تائید میں وہ جب قرآن مجید کی آیتیں پیش کرتے ہیں، تو ان کا مطالعہ کرتے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم عربی زبان کی کوئی عبارت پڑھ رہے ہیں، بلکہ ان کے ترجمے اپنی تحریروں کے ساتھ ایسا منسلک کر دیتے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت وہی لطف آتا ہے، جو عربی زبان کے ماہرین کو کلام پاک کی آیتوں کو پڑھنے میں آتا ہوگا۔

شرک کی حقیقت کو کس شگفتہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں:

"شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے، اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان

ان اسباب وعلل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے۔ اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعوی کو اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے، کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے، اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

(سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۱۸-۲۱۷)

شاعروں کی زبانی دل کی نیرنگیاں تو بہت کچھ سننے میں آتی رہتی ہیں، اب ذرا سیرۃ النبیؐ کے مصنف سے اس کی بوقلمونی کا مشاہدہ کریں، رقمطراز ہیں۔

"ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا مرکز ہے، فرمایا، انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے، تو تمام بدن درست ہے، اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

(جلد ۴ صفحہ ۲۰۵)

آخری سطریں حدیث کے ترجمے ہیں، لیکن عبارت کے سلسلہ میں ایسے جڑ دیے گئے ہیں کہ تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہونے پایا ہے، یہ تو حدیث کے ذریعے دل کو سمجھایا گیا ہے اب قرآن مجید کے ذریعہ اسکو اس طرح سمجھایا ہے:

(الادارہ)



"قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قلب سلیم (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قلب اثیم (گنہ گار دل) یہ وہ جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قلب منیب (رجوع ہونے والا دل) ہے۔ جو اگر کبھی بھٹکتا ہے، اور بے راہ بھی ہوتا ہے، تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۰۶)

یہ قسمیں بتا کر سید صاحب اپنے انشاء کے مخصوص رنگ میں لکھتے ہیں۔

"غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں، جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے۔" (ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۰۶)

اس کے بعد یہ سمجھاتے ہیں کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اصلاح مقدم ہے، اس کے دل پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے، تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔

اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت ہی ہم اپنے تمام کام انجام دیں، اس کو اپنی دقت نظر سے کام لیتے ہوئے اس طرح سمجھاتے ہیں:

"جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے، اور نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے لئے چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔"

(ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۰۷)

پھر عقل اور دل کی تھوڑی سی بحث آگئی ہے، اس کی تصریح کرنے میں اپنی فکر کی گہرائی کو بروئے کار

لاتے ہیں۔

"بظاہر عقل ہمارے کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے، لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، اس لئے اس پابزنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی ذہنی تصورات کے ذریعہ۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۴۰۰)

ان صحیح دلی یقینیات اور مضبوط ذہنی تصورات کو سید صاحب ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی مزید تصریح اس طرح کرتے ہیں۔

"قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے، کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے"

(ایضاً جلد ۴ صفحہ ۴۰۰)

عقیدہ، ایمان، عمل صالح، اور حسن عمل کے دارومدار کی وضاحت کس خوبصورتی سے کردی ہے، جس کو سمجھنے میں ایک عامی قاری کو بھی دقت نہیں ہوگی، انداز بیان کی یہی سلاست اور سریع الفہمی ان کی تحریر کی خوبی ہے،

اس جلد میں کچھ تاریخی واقعات بھی آگئے، جن کو قلمبند کرنے میں ان کا انداز بیان مورخانہ ہوگیا ہے، پانچویں صدی میں رومن امپائر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں،

"پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب سے لیکر دجلہ اور نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اس کی حالت بھی



روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے، کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں چھ لاکھ پینتالیس ہزار تھی، اب شاہ جسٹینین کے زمانہ یعنی ۵۲۷ء میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی کل ڈیڑھ لاکھ رہ گئی تھی، اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں، رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امراء و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لیے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی، اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فن جنگ سیکھنے کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے، اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔ اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لیے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا جو ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس گوتھس اور وندالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے"

(سیرۃ النبی جلد ۴۔ صفحہ ۲۲۱-۲۲)

اس سیاسی افراتفری میں مذہب کا جو حال ہوا، اس کی بہت دل خراش تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

"بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی، اور لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کرلی تھی، وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰ اور مریم اور روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے، جن میں زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ و جدل کی

نوبت آگئی تھی، یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان
ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا،
اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا،
اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصب
مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اور اس بنا پر محض حب جاہ کی خاطر
وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۲-۲۲۲)

اور پھر اس زمانہ کی باہمی سفاکی کا ایک دل دوز منظر اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"اسقف اعظم سینٹ سرل ..... کی ایک خاتون دوست ملیشیا نامی تھی، ایک
روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آرہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کردیا،
گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی، اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں
لائے، جہاں پہونچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کردیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت
ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال
دیا گیا۔" (ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۲۳)

اتنا لکھ کر سید صاحب کچھ چبھتے ہوئے جملے لکھتے ہیں، جن میں زہریلا طنز بھی ہے لیکن یہ ان حملوں کا منہ توڑ
جواب ہے جو عموماً عیسائی مشنریوں اور مورخوں کی طرف سے اسلامی تاریخ کے ایسے واقعات پر
ہوا کرتے ہیں،

سید صاحب رقمطراز ہیں۔

"یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے، مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں
کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔"



اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں ان رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب
پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ
تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے، (سیرۃ النبی ج۴ صفحہ ۲۲۲)
اور اس کے بعد ان کے لکھنے کا انداز وہی ہے، جو مستشرقین اسلام پر حملہ کرنے میں
اختیار کرتے ہیں، سید صاحب لکھتے ہیں۔

"نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں
ہوئیں، انھوں نے اس حقیقت کو واضح کردیا، کہ شہزادہ امن کا مذہب ان جنگ جویوں
کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔" (ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۲۴)

شہزادہ امن سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اس آخری اقتباس کے آخری
جملہ سے عیسائی مذہب کی پوری تاریخ پر بڑی ضرب کاری لگادی گئی ہے۔

**سیرۃ النبیؐ جلد پنجم**

سیرۃ النبی جلد چہارم کی اشاعت کے دو سال کے بعد سیرۃ النبی جلد پنجم ۱۹۳۴ء
میں شائع ہوئی، جس کی ضخامت ۵۰۳ صفحے ہے، چوتھی جلد کا موضوع عقائد تھا،
اس پانچویں جلد کا موضوع عبادات ہے، یعنی اسلام میں عبادات کی حقیقت کیا ہے، اس کے
اقسام کتنے ہیں، ان میں کیا مصلحت وحکمت رکھی گئی ہے، اس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور
حج کے ابواب بھی ہیں، یہ موضوعات نئے نہیں ہیں، لیکن اس کتاب کے مصنف نے جس انداز
میں ان کو پیش کیا ہے، اس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ ایسی باتیں معلوم
ہو رہی ہیں، جو پہلے معلوم نہ تھیں، حالانکہ وہ جانی بوجھی چیزیں ہیں، لیکن انداز بیان کی خوبی سے وہ چیزیں
نئی معلوم ہوتی ہیں، وہ کلام پاک کی چھوٹی بڑی اور لمبی آیتوں کو اپنی تحریروں میں اس طرح جڑ دیتے ہیں

وہ نگینوں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں، اور جب ان کے مطالب کو سمجھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارے سامنے دل نواز باتوں اور دلنشیں تحریروں کا خوان یغما بچھا ہوا ہے، احادیث کی تشریح کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محدثوں نے جن باتوں کی طرف توجہ نہیں دلائی تھی انکی طرف توجہ دلا رہے ہیں، اس کتاب کے جو موضوعات ہیں ان میں فقہا کا بڑا اختلاف رہا ہے، لیکن اس سلسلہ میں سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بڑے سے بڑے دیدہ ور فقہا کو اس سے اب تک اختلاف نہیں ہوا ہے، اس میں ان کے انداز بیان سے ان کو بڑی مدد ملی، جس میں کچھ انکے کلامی رنگ کے خیالات جملوں اور فقروں کے پیکر میں نہ صرف صفحات بلکہ سینۂ دل میں بھی اترتے ہیں، مثلاً نماز کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار اس رحمان اور رحیم کی یاد، اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا، اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے"، (ج ۵ ص ۵۹)

یہ ادب لطیف کی عبارت نہیں، بلکہ اسلام کے ایک سچے عاشق کے دل کی آواز ہے، اور کون ایسا عالم، متکلم، صوفی، عارف باللہ یا معمولی بندہ ہے، جو اس کو پڑھ کر سرشار نہ ہو جائے ایسی عبارت آرائی، غنچوں، پھولوں، گلزاروں اور بلبل کی نغمہ سرائیوں کی مرقع آرائی کرتے



وقت خوب نکھرتی ہے، مگر سید صاحب نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کو ریاض رسول کے نکہت بیز اور شامہ نواز پھول ہی سمجھتے رہے، اس لئے ان کا ذکر کرنے میں بلبل خوشنوا ہی بنے رہے۔

زکوٰۃ کے جتنے افادی، شرعی اور فقہی پہلو ہیں، ان سب پر سید صاحب نے بحثیں کی ہیں، لیکن طرز ادا کی دل نشینی کی وجہ سے ان کو پڑھنے میں لطیف نکتے اور شریعت کے اسرار کی محرمی جدید ذہن پر بھی آشکارا ہوتی نظر آتی ہے، اس کی اہمیت کیلئے استدلال کا زور ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں۔

"قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی برابر زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ۳۲ مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ہی ایتاء زکوٰۃ آیا ہے (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۱۵۲)

اس کی اہمیت پر مزید زور یہ لکھ کر دیتے ہیں۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے، اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس کی پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی"۔

اور پھر ذرا دعویٰ کی اس بلند آہنگی پر غور کریں۔

"نماز اور زکوٰۃ توام ہیں، ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے" (ج ۵ ص ۱۵۴-۱۵۵)

اس سلسلہ میں ان کے قلم کا زور کس طرح بروے کار آجاتا ہے اس کے ایک نمونہ سے پھر ایک بار لطف اندوز ہوں۔

"زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری،

مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبرگیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت

نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی سب سے پہلی اہمیت ہے،

جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۱۵۴)

روزہ کی تصریح کرتے ہوئے اپنے لسانی ذوق کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں،

"روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں، جس کے لغوی معنے رکنے اور چپ رہنے کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے، جس کے معنے ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔"

پھر اس کی غایت کی تصریح اس حسن ادا سے کرتے ہیں،

"اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے، وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے، اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ کے استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور ان کی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔"

(جلد ۵ صفحہ ۲۸۱)

رمضان کے مقدس مہینے میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس کے تقدس کا احساس ہمارے دلوں میں یہ لکھ کر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔



"رمضان وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۲۰۹)

پھر رمضان کے روزے کی اہمیت کو اس بلیغ انداز میں بتایا ہے کہ

"یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں، بلکہ درحقیقت اللہ تعالےٰ کے اس عظیم الشان احسان کا شکریہ ہے، جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکر اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی۔ جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلمانی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ ۲۳)

اور یہ (رمضان کا روزہ) اس لئے فرض ہوا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو،

(سیرۃ النبیؐ جلد ۵ صفحہ ۳۶۰)

حج پر بھی لمبی بحث ہے، لیکن اس سلسلہ میں خانہ کعبہ کے متعلق ان کی جو سرشارانہ تحریر ہے

اسی سے حج کی ساری تفصیلات معلوم ہو جائیں گی، اس اقتباس کو پڑھتے وقت اپنا جائزہ اس حیثیت سے لیں کہ اس کے لکھنے والے پر جو انبساطی کیفیت طاری ہے، اس کا اثر آپ کے دل پر کیا مترتب ہوتا ہے؛

"خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے، جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے، جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا، اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے، جس کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں، اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن، معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم)، اور ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی)، اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے، جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کیلئے ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں، دوش بدوش ہو کر حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں



کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے، جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، اس لیے یہ حرم ربانی نہ صرف اس معنی میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیتا ہے۔ (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۷۵-۲۷۴)

اس جلد میں جہاد پر بھی بحث ہے، اسکی لغوی، معنوی، اصطلاحی اور عمومی حیثیت کو کس ٹھنڈے پیرایہ میں سمجھاتے ہیں، وہ ذرا ہم آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں، لکھتے ہیں:

"جہاد کے معنے عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد، مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنے بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جد و جہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی، مالی اور دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالٰے کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لئے اپنے عزیز و قریب، اہل و عیال، خاندان اور قوم کی جان تک کو قربان کر دینا، حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا انکی تدبیروں کو رائگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اسکے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔" (ایضاً جلد ۵ صفحہ ۲۹۹)

پھر جہاد بالنفس، جہاد بالعلم، اور جہاد بالمال کو جس طرح آسانی سے سمجھا دیتے ہیں،

اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اور پھر دائمی جہاد کو کیسے ولولہ انگیز پیرایہ میں سمجھاتے ہیں:

"دائمی جہاد یہ ہے کہ پر امن دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیردستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے۔" (ج ۵ ص ۳۰۹)

یہ تحریر ایجاز کی بھی ایک مثال ہے، اس کا اطناب جس طرح کو چاہیں کر لیں، انکی تحریروں میں دل کی جو کرشمہ سازیاں ہیں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اب اس جلد میں لکھتے ہیں کہ جسمانی اور مالی عبادات کے علاوہ قلبی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، سید صاحب کے خیال میں ان قلبی عبادات میں سرفہرست تقویٰ ہے، اس کی لغوی اصطلاحی، مذہبی اور روحانی حیثیت کو سمجھانے میں ایک معلم کے فرائض ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

"قلبی عبادات میں سرفہرست تقویٰ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ بلکہ روح ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنے بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ بنائے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر اس کا بظاہر نقصان ہو مگر وہ



سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام و محنت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور بڑا صلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں بندوں کے درمیان ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہوتی ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۳۱۴-۳۱۶)

یہی بات محراب کے نیچے منبر پر بھی کہی جاتی ہے، لیکن اس میں واعظانہ رنگ ہو جاتا ہے، اوپر کے اقتباس کا رنگ بظاہر تو معلمانہ ہے، لیکن اس کو پڑھتے وقت کچھ فلسفیانہ طرز فکر کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اخلاص کو بھی قلبی عبادت بتایا ہے، اس کو تحریر کے پورے وزن کے ساتھ سمجھایا ہے۔

"جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت، طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے۔" (ایضاً جلد ۵ صفحہ ۳۳۰)

توکل کو بھی قلبی عبادت قرار دیتے ہیں، اس کو سمجھانے کا یہ متین انداز ہے۔

"توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اس کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں خود اعتمادی کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔" (ج ۵ ص ۳۳۶)

صبر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے، اور اس کو اس طرح ذہن نشین کرایا ہے۔

"صبر بے بسی اور بے کسی یا دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لینے کا نام صبر نہیں،

بلکہ لغوی معنی تو اس کے روکنے اور سہارنے کے ہیں، معنوی حقیقت اسکی یہ ہے کہ اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اسکے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں" (ج ۵ ص ۳۳۰)

پھر اس کی مختلف قسموں پر بحث کرنے میں اپنی نکتہ وری اور نکتہ سنجی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ شکر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں، کہ اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے، اس کے مقابلہ میں اللہ تعالٰے کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کرنے کا نام شکر ہے، پھر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہونچاتا ہے، تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے، تو یہ بھی قوت اور طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے"

(سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۳۵۰)

ایسی عبارت کوئی عارف باللہ ہی لکھ سکتا ہے، اوپر کی تمام باتیں تو کلام پاک کی ہیں، لیکن ان کو اس طرح کاغذ کے صفحات پر منتقل کیا ہے کہ پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ جو چیزیں ان کے تحت الشعور میں دبی ہوئی تھیں وہ ابھر رہی ہیں، اور یہ تمام چیزیں کچھ ایسی فصاحت اور سلاست سے قلمبند ہوئی ہیں کہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسی عبارت تو جو چاہے لکھ سکتا ہے لیکن



موضوع کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی تحریر لکھنا چاہے تو اس کو اپنی کوتاہ قلمی اور کج بیانی کا احساس ہو جائے، سید صاحب کی تحریر کی امتیازی شان یہی ہے، کہ موضوع تو خالص مذہبی ہوتا ہے، لیکن اس کو قلمبند اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم کو روح افزا شربت پلایا جا رہا ہے، اور ہم خوش خوش پی رہے ہیں۔

اس میں جا بجا فقہی مسائل پر بھی مباحث ہیں، ان میں مناظرانہ رنگ پیدا ہونے نہیں دیا ہے بلکہ قرآن مجید اور احادیث کے ذریعہ سے جس نتیجہ پر وہ خود پہونچے تھے، ان کو اس طرح قلمبند کر دیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں شکوک و شبہات نہ رہیں۔

پانچوں وقتوں کی نماز کی تفصیل اس طرح بتاتے ہیں۔

" نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، قٓ، روم اور نور میں، ظہر کا بالاجمال دہر، قٓ، طٰہٰ اور اسراء میں، اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، قٓ اور روم میں، مغرب کا بالاجمال، ہود، طٰہٰ اور روم میں، اور بالتصریح قٓ میں، عشاء کا بصورت صلاۃ اللیل مزمل، طور اور دہر میں، اور بصورت عشاء بالاجمال ہود، اور روم میں، اور بالتصریح قٓ اور ہود میں ہے، تمام نمازوں کا بالاجمال تذکرہ بقرہ اسراء اور طٰہٰ میں ہے۔ طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود، اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی نماز ثابت ہے" (سیرۃ النبی۔ ج ۵ ص ۹۱)

جمع بین الصلوٰتین کی تصریح کرتے وقت قرآن مجید کی یہ آیت سامنے رکھی،

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ٥ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ٥

اللہ کی تسبیح کرو، جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو، اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے، اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور ظہر کرو۔

اس کی تفسیر بیان کرنے میں پورے مسئلہ کا حل پیش کر دیا ہے، لکھتے ہیں کہ سورۂ روم کی اس آیت سے ظہر و عصر کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نماز میں اجمال ہے، یعنی مغرب و عشاء دونوں حین تمسون (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علحدہ بھی، ہیں، اسی بنا پر اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علحدہ ذکر کی گئی ہے، اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں، اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۹۲-۹۱)

نماز باجماعت کی تصریح جس طرح کی ہے، اس سے ہم آپ لطف اندوز ہونے کے علاوہ کچھ سبق بھی حاصل کریں۔

”کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے۔

اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملانا اور



یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اس طرح پوری قوم کی زندگی اس باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوں کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمھارے دل آپس میں نہ ملیں گے۔

(سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۱۳۰)

**سیرۃ النبی جلد ششم** سیرۃ النبی جلد پنجم کی اشاعت کے پانچ سال کے بعد سیرۃ النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جسکی ضخامت ۸۰۰ صفحے ہے، اس وقت سید صاحب کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی۔ مگر اس کی ضخامت اور اس کے مسائل کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کی تصنیفی زندگی کی جوانی، رعنائی اور دل آویزی برقرار تھی، اور پہلے ہی کی طرح ان کے قلم کا طاؤس رقص کرتا نظر آتا ہے، اس جلد کا موضوع اسلام میں اخلاقیات ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے طرز فکر میں گہرائی اور گیرائی ہو، اور طرز ادا میں عظمت اور وقار ہو، یہی چیز ان کی اس پوری کتاب میں چھائی نظر آتی ہے۔ جو ان کی انشاپردازی کے مختلف جلووں میں سے ایک علحدہ جلوہ ہے، اس میں فضائل اخلاق، رذائل اخلاق اور آداب اخلاق کے علحدہ علحدہ عنوانات کے تحت مباحث ہیں، ان میں جو بات کہی گئی ہے، اس کی تائید میں پہلے قرآن مجید کی آیتیں اور مقدس حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں اور یہ تمام مباحث اس لئے خشک نہیں ہونے پائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے جلوہائے ہزار رنگ کو اس طرح قلمبند کیا گیا ہے کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا کہ ہم مواعظ کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ محبت بھری حکایتوں کے ایک مجموعہ سے دل و دماغ کو محظوظ کر رہے ہیں، ان واقعات کو جمع کرنا تو تلاش و تحقیق کی دلیل ہے، لیکن ان کو دل نشین

اور دل آویز انداز میں پیش کرنے میں قلم کے اعجاز کی ضرورت تھی، جو اس میں پورے طور پر نظر آتا ہے، اس ضخیم کتاب میں جو اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں وہ تو اس مقالہ کا موضوع نہیں، لیکن جس طرح وہ قلمبند کی گئی ہیں، ان کا پورا تو نہیں، ہاں تھوڑا سا احاطہ کرنا یہاں پر ضروری ہے،

طرز ادا کی رعنائی کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے کریں۔

"ایمان کے بعد، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہو۔ بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھے مقررں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے، اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے، اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں"۔ (سیرۃ النبیؐ جلد ۶ صفحہ ۱۰ - ۱۱)

آخر کے چند جملوں سے ان مذہبی مواعظ میں کیسی دلکشی پیدا ہو گئی ہے، ذرا حسب ذیل



ٹکڑوں سے بھی اپنے قلب کو منور کریں۔

"یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے، اس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ (سیرۃ النبیؐ جلد ۶ صفحہ ۲۴)

"اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں" (ج ۶ ص ۲)

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمان الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکم فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے"۔ (ج ۶ ص ۲۸)

"انبیا علیہم السلام جو کچھ کہتے ہیں، وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منہ پر ہے، وہی دل میں ہے، اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا، اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکما یعنی موسیٰؑ عیسیٰؑ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہیں، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج پر پہونچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے"۔ (جلد ۶ صفحہ ۲۹ و ۳۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ رتبہ متعین کرنا چاہتے ہیں، تو پہلے آپ سے پہلے کے انبیائے اکرام کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس اسلوب میں کرتے ہیں، اس کا لطف لیتے ہوئے اس کی نکتہ آرائی پر بھی غور کریں۔

"کوہ زیتون کے پرتاثیر واعظ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی معصومانہ باتیں سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں لفظی صنائع وبدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں، دنیا نے سنیں، اور اس کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ سب کچھ جو تمھارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے، کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ شریروں کا مقابلہ نہ کرو، کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان ومال سے پیار کر، کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ اگر تمھارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو، کیا اس نے خود بھی ایسا کیا، وہ جس نے یہ کہا کہ تم سے اگر کوئی تمھارا کرتا مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کردو، کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۳۳-۳۲)

یہاں تک وہ سب کچھ کہہ گئے جو کہنا چاہتے تھے، مگر وہ حضرت عیسیٰ کی نبوت پر ایمان کامل رکھتے تھے، ان کا احترام بھی ان کو کرنا تھا، اس لئے ان کا ادب شناس قلم رکتا ہے، اور اپنے قارئین کے



ذہن کو اس کے بعد بجا دو جملوں سے مسحور کر دیتے ہیں کہ۔

"ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح میں یہ صفتیں موجود تھیں، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے"۔ (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۳۳)

اپنے قلم کی اس احتیاط کے بعد اپنے ناظرین کے ذہن کو یہ لکھ کر مسخر کرتے ہیں۔

"مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کرکے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (بقرہ-۵) کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو، اور مسلمانوں کو متنبہ کیا

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (صف-۱)

تم کیوں کہتے ہو کہ جو کرتے نہیں بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔" (جلد ۴ صفحہ ۳۳)

اس میں قرآن مجید کی آیتیں اس طرح شامل ہوگئی ہیں کہ تحریر کی لڑیوں سے جدا نہیں معلوم ہوتی ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اخلاق کے جلوؤں کو اس طرح دکھاتے ہیں۔

"ایک شخص نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، کان خلقہ القرآن، جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔"

وہ عملی صورت کیا تھی، ذرا ان ہی کے قلم سے سن کر عشق رسول سے بجا طور پر تھوڑی دیر کیلئے سرشار ہولیں:

"اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو

معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا جنھوں نے آپ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔" (سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۳۴)

ان عملی نمونوں کے افادی پہلوؤں کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

"دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف اقوال او تعلیمات سناتے ہیں، انکی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اسکے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور انکی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم عصروں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اسکے معاصرین کے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا۔" (جلد ۶ صفحہ ۳۴)

پھر رسول اللہ کی تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو، اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک وصاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جسکو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے



یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ - ۱)

وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ (ص ۳۵)

قرآن کی یہ آیت یہاں اس طرح لکھی گئی ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ قلم غیبی صدا دے رہا ہے کہ جو کچھ نثر میں لکھا جا رہا ہے، وہاں پر اسی آیت کے نقل کرنے کی ضرورت ہے، پھر اسی چھوٹی سی آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں۔

"اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہ گاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، ۲۳ برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہونچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہونچ سکا۔ (ج ۶ ص ۳۶)

پھر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے جلوہ ہائے صد رنگ کس کس طرح سے نمایاں ہوئے اس کے موثر انداز بیان کی تاثیر سے متاثر ہونا لازمی ہے، رقمطراز ہیں۔

"اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں کر

ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے دہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں" (سیرۃ النبی ج ۶، ص ۳۶)

اتنا لکھنے کے بعد ان کے قلم میں بجلی کی سرعت پیدا ہو جاتی ہے رقمطراز ہیں،

"لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔ (ایضاً ج ۶، ص ۳۷)

مجلس نبوی کی مرقع آرائی کر کے ہمارے اور آپکے ایمان کو منور کرنے کا پورا موقع دیا ہے، لکھتے ہیں۔

"آپ کی حیثیت ایک انسان ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست ایک خانہ دار، ایک کاروباری ایک تاجر ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ ایک مرشد، ایک زاہد، ایک عابد، اور ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپکے سامنے آکر زانوے ادب تہ کرتے ہیں، اور اپنے شعبہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبی کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان



انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں، ابوبکرؓ، وعمرؓ، عثمانؓ، وعلیؓ جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و معاذؓ و سعد بن معاذؓ و سعد بن جبیرؓ جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں کہیں خالدؓ ابو عبیدہؓ و سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار بیٹھے ہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران عدالتوں کے قاضی اور قانون کے معلم بنے کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں، راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابو ذرؓ و سلمانؓ اور ابو درداؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب علم تھے، جو جنگل سے لکڑیاں لا کر بیچتے، اور گذارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے، اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں" (ج ۶، ص ۴۰)

ایسا مرصع کار مینا نگار طرز بیان وہی اختیار کر سکتا ہے، جو عشق رسول میں سرشار ہو، اس میں نہ صرف جذبات کا جوئبار نظر آتا ہے، بلکہ مجلس نبوی کی صحبت گہربار کا نقش و نگار اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ یہ قلمی محاکات کی بہت عمدہ مثال بھی بن گئی۔

**سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم** | سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم، سید صاحب کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے، وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، اس کو شروع کیا تھا لیکن اس زمانے میں ان کی نجی اور علمی زندگی میں بعض اسباب کی

بنا پر بڑا انتشار رہا،

وہ اپنی علالت اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے بھی پریشان رہے، پھر جلد ہفتم لکھنے کا وقت انکا وقت حیات شبلی کی ضخیم جلد کی تدوین میں بھی صرف ہوا، ان اسباب کی بنا پر ان کی ساتویں جلد تیار نہ ہو سکی، چند ابواب لکھے تھے، جن کے عنوانات یہ ہیں، اسلام میں حکومت کی اہمیت، عہد نبویؐ میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق، امت مسلمہ کی بعثت قوت عاملہ یا قوت آمرہ، حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے،

اس میں ان کی فکر کی گہرائی تو ضرور ہے، لیکن تحریر کا وہ جوبار اور روودھار بہتا نظر نہیں آتا، جو سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ جلدوں میں نظر آتا ہے پھر بھی اس میں ان کے قلم کی پختگی نظر کی جامعیت اسلام کی روح سے آشنائی، اور اظہار رائے میں اعتدال و توازن تو اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے، جیسا کہ ان کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگا، ان سے ان کے سیاسی افکار و خیالات بھی معلوم ہو جائیں گے، اور ان کا طریقۂ بیان بھی، خلافت راشدہ اسلام کی تاریخ میں ایک آئیڈیل حکومت سمجھی جاتی ہے، اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی، اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری، اور زعیمی حکومتوں کے خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اسکی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا، اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ اوتاری ہے نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے، اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے، جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو کچھ ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے



خالی ہے، اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی کبھی شخصی کبھی زعیمی کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی" (سیرۃ النبی جلد، صفحہ ۱۹۰)

پھر اس کی تصریح اس طرح کرتے ہیں جس میں ان کی امعان نظر بھی نمایاں ہے، اس کو جس باریک بینی سے قلمبند کرتے ہیں، وہ قابل غور ہے۔

"اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اسمیں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے، جو رسول کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے اسکو تسامحاً دستوری کہدینا ممکن ہے، اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں، اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہدینا ممکن ہے، اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کیلئے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈکیٹر سمجھا جاسکتا ہے،" (ایضاً جلد، صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۰)

خلافت راشدہ کے مختلف بلکہ پیچیدہ پہلوؤں کو کس صاف سلیس اور عام فہم انداز میں ایک پیراگراف میں سمجھا دیا ہے جو اور کسی اہل قلم کے لیے پورے ایک باب میں بھی سمجھانا مشکل ہو جاتا، یہ صرف نفس مسئلہ کے ساتھ قلم پر قدرت کی بھی دلیل ہے، لیکن اوپر کے اقتباس کے بعد فوراً ہی اپنے قارئین کو یہ لکھ کر مسحور کرتے ہیں کہ

"لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے کوئی ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔"

(سیرۃ النبی جلد، صفحہ ۱۹۱)

اور اسی کے بعد اسلامی سیاست کی اسلامی روح کو جس پر زور، موثر اور خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے، وہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لئے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی، اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوری کی ترتیب اور تعین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے (ایضاً جلد، صفحہ ۱۹۱)

اور پھر اس سیاسی تقویٰ کو جس طرح سمجھایا ہے اس کے سمجھنے میں کسی وقت نظر کی ضرورت نہیں، وہ یہ لکھ کر ہماری تواضع کرتے ہیں،

"یہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تعیین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے۔ اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کے



ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔" (سیرۃ النبی جلد، صفحہ ۱۹۲)

تقویٰ کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے اسلامی سلطنتوں اور عام سلطنتوں کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں، اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی ہر کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں" (ج، ص۱۹۳)

ایک بہت ہی پیچیدہ، عمیق اور متنازعہ فیہ مسئلہ کو کیسے ٹھنڈے لہجے میں اور ٹھنڈی تحریر کے ذریعہ سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو اس بات کا بھی ثبوت ہے، کہ ضرورت کے وقت وہ اپنی تحریر کے ذریعہ جذبات میں تلاطم اور تموج بھی پیدا کر سکتے ہیں لیکن جب غور و فکر کرتے اور کسی نتیجہ پر پہونچنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لئے دعوتی انداز کی تحریر لکھ کر ذہن کو منور و متجلی کرتے ہیں۔

تتمہ | تین ہزار دو سو چھیاسٹھ ۳۲۶۶ صفحے کی سیرۃ النبیؐ کی پانچ جلدیں لکھ کر سید صاحب نے جوئے شیر علم اسلامی کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، لیکن اسی فرہاد نے ان جلدوں کے ذریعہ سے اپنی انشاپردازی کا جو قصر شیریں تیار کیا، وہ اسی کے ساتھ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے، ان میں جو انداز بیان ہے، وہ دنیا کے کسی زبان کے عظیم ترین مصنفوں کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے، ان کو عربی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی، وہ اس کے بڑے اچھے اہل قلم تھے، ان کو فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی، وہ انگریزی زبان سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے، اس کی اہم کتابیں اور اخبارات میں برابر ان کے مطالعہ میں رہتے، اردو تو ان کی مادری زبان ہی تھی، لکھنؤ میں تعلیم پائی، اور اپنی عمر کا زیادہ حصہ یہیں گذارا، پھر علامہ شبلی کی صحبت برابر حاصل رہی، ان تمام اثرات کی وجہ سے انکی تحریروں میں عربی زبان کی جزالت، شوکت اور حشمت آئی، فارسی زبان کی فصاحت، حلاوت اور تمکنت غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں میں منتقل ہوتی رہیں، پھر شاید ان کو بھی خبر نہیں رہی کہ انگریزی زبان کے طرز ادا کی برجستگی اور روانی ان کی تحریروں کا پیچھا کرتی رہیں، علامہ شبلی نعمانی کی انشاپردازی کا وصف اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ سر سید نے ایک کان سے اردو کی نثر نگاری کا ایک ہیرا نکالا، حالی نے اس میں جلا دی، نذیر احمد نے اس میں چمک پیدا کی اور محمد حسین آزاد نے اس میں دمک عطا کی، مگر جس نے اس ہیرے کو کوہ نور بنا دیا وہ علامہ شبلی نعمانی ہیں، اسی کوہ نور کا پرتو ان کی بزم کے صدر الصدور کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی ان پانچ جلدوں میں کہیں تو اس کا اسلوب ایسا ہے، جو کسی باوقار مفسر کا ہونا چاہئے کہیں اس کا انداز بیان وہ ہے، جو باوزن محدث کا ہوتا ہے کہیں انداز رائے وہی ہے جو ایک دیدہ ور فقیہ کے یہاں تلاش کیا جاتا ہے کہیں طرز استدلال وہ ہے جس کی ایک مخلص متکلم سے توقع کی جاتی ہے، کہیں فکر کی گہرائی ایسی دکھائی دیتی ہے، جو ایک فلسفی کے طرز ادا میں



دکھائی جاتی ہے، کہیں، رجز خوانی کا وہ انداز ہے، جو سالار کارواں کے منہ سے سنائی دیتا ہے کہیں وہ حدی خوانی ہے، جو منزل کو طے کرنے میں مدد دیتی ہے، ان ہی اجزائے ترکیبی سے سیرۃ النبیؐ میں ان کی تحریروں میں وہ انشاپردازانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس کے سہارے اس کے مطالعہ میں نشاط و انبساط کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

اگر تکرار کے خیال کو صرف نظر کر دیا جائے تو آخر میں یہ بھی کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سید صاحب کو غیر معمولی محبت، شیفتگی اور وارفتگی رہی، اسی لئے ان کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں میں ان کے خون جگر کی لالہ کاری، سوز دل کی چنگاری علوئے ہمت کی اولو العزمی اور حسن ذہن کی عفت مآبی پورے طور پر نظر آتی ہے، اسی لئے ان جلدوں کی تحریروں میں ایمان کی طہارت، صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو زندگی سنوارنے کی بشارت کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، اسی کی بدولت ان جلدوں میں ان کے اسلوب طرز ادا اور انداز بیان کے وزن، وقار، کمال اور جمال کی ایک خاص قسم کی آن، بان اور شان پیدا ہو گئی ہے، جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں مل سکے گی۔

ایک بات اور، حضرت سید صاحب نے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبال کی وفات حسرت آیات پر جو شذرات معارف میں لکھے ہیں، وہ ان کے ادب و انشا کے سونے کے ٹکڑے سمجھے جاتے ہیں، اور سمجھا جانا چاہئے، یہ جذبات سے لبریز ہو کر لکھے گئے ہیں، جب کسی تحریر پر جذبات اور خصوصاً المناک جذبات کا رنگ چھا جاتا ہے، تو اس کا موثر ہونا لازمی ہے، انھوں نے جگر مراد آبادی کی شعلۂ طور پر جو مقدمہ لکھا ہے، یا ان کی نقوش سلیمانی میں جو ادبی مضامین ہیں، ان میں بھی ان کی ادبی شان پورے طور پر نمایاں ہے، شعر و ادب پر جو بھی تحریر لکھی جائے گی، اس میں زبان کی شستگی اور بیان کی رنگینی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے، انکی خطبات مدراس میں

اس کا ہر صفحہ شیوہ بیانی کا مرغزار اور گلزار بن گیا ہے، وہ محض اس لئے کہ یہ بھی عشق رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں سرشار ہو کر لکھی گئی ہے، اس میں محبت کے گل اور شیفتگی کے بوٹے تحریری شکل میں نمودار ہو گئے ہیں، جو تعجب انگیز نہیں ہے، سید صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں میں بھی یہی وارفتگی ہے، مگر اسی کے ساتھ ان میں معجزات، مشاہدات، مسموعات، اسرار، معراج، شق القمر، شق صدر، منصب نبوت، ایمان، برزخ، قیامت، نور، ظلمت، خیر، شر، توحید، عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، صبر، توکل، شکر، جہاد، تقویٰ، فضائل اخلاق، رذائل اخلاق، فلسفہ اخلاق، معاملات، سیاست اسلامی، نظام حکومت اسلام اور حکومت الٰہیہ وغیرہ جیسے خشک مسائل ہیں، ان کو تحریر کی فصاحت، انداز بیان کی بلاغت، عبارت کی نفاست، جملوں کے دروبست اور ان کے صحیح استعمال کی مہارت، الفاظ کے انتخاب کے حسن ذوق، قرآن مجید کے رموز اور حدیث پاک کے نکات کے غوامض اور کلامی نکتہ وری کی سریع الفہمی کے ساتھ قلمبند کرنا بڑا مشکل کام تھا، بلکہ دشواریوں کے ہفت خوان کو طے کرنا تھا، لیکن ان مشکلوں اور دشواریوں سے حضرت سید صاحب جس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں، وہ بھی ان پانچوں جلدوں کے اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں،

نوٹ :- یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ اردو کے اس سمینار میں پیش کیا گیا جو حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ پر منعقد کیا گیا تھا۔

---





# مسدسؔ حالی میں ربط و تسلسل

از جناب تاج پیامی صاحب آرہ

مسدس کی ہیئت میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اشعار کا تعین نہیں ہوتا، اور ایک بند میں ایک خیال تفصیل سے پیش کیا جا سکتا ہے، شہر آشوب، تاریخی واقعات اور مرثیہ کے لیے یہ ہیئت بہت پہلے سے مستعمل ہے، حالی نے اپنی اس تاریخ ساز تاریخی اور قومی نظم میں مسلمانوں کا مرثیہ ہی پیش کیا ہے، مسدس حالی سے متعلق علامہ سید سلیمان ندویؒ "نقوش سلیمانی" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس نظم کے لیے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا، مسدس اس زمانہ میں واسوخت کے لئے، پھر اہل بیت کرام کے دلدوز مصائب اور شہید کربلا کے دلفگار سوانح کے بیان کے لئے یک گونہ مخصوص ہو کر غم والم کی داستان سرائی کے لیے خاص ہو چکا تھا، اس لئے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا تو مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی، جس کا وزن ہی گویا دردوغم اور نالہ و ماتم کے لئے بن چکا تھا"

مسدس میں شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثۂ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کئے تھے، جن کو سن کر ان بے خبروں کو جن کو دفعۃً ۱۸۵۷ء کے حادثۂ خونین کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرت ناک انجام پر سخت حیرت تھی، شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر ان کی حیرت کو دور کیا، اور

ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں زندگی تعجب انگیز تھی"

حالی نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے احوال و اسباب کو ربط و تسلسل اور ارتقائے خیال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حالی مسدس کی ترتیب، موضوع اور اسلوب کے بارے میں خود لکھتے ہیں :۔

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے، جو ظہور اسلام سے پہلے تھی جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے، پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا، نبی امیؐ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتہً سرسبز ہو جانا اور ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑنا، اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی قیادت میں تمام عالم میں سبقت لے جانا، بیان کیا ہے، اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے، اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے"۔

مذکورہ اقتباس کا حوالہ پروفیسر کلیم الدین احمد اپنی کتاب اردو شاعری پہ ایک نظر میں پیش کرتے ہیں، اس کے باوجود لکھتے ہیں :۔

"مسدس کے مضامین میں ربط و تسلسل مکمل نہیں، اور ارتقائے خیال بھی فطری نہیں، ارادی ہے، مضامین پھول کی طرح نہیں کھلتے بلکہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر مسدس کی عمارت بنائی گئی ہے، اینٹیں ایک دوسرے سے پیوستہ نہیں، دیواریں ہیں تو کج اور بے ڈھنگی، مینار و سقف میں بھی تناسب نہیں، یہ تعمیری کمی پوری نظم میں بھی ملتی ہے، اور اس کے محدود ٹکڑوں میں بھی، دو مصرعوں، دو بیتوں، دو بندوں میں وہ ربط و تسلسل نہیں جو ہونا چاہیے"۔

مسدس حالی پر پروفیسر کلیم الدین کے یہ سارے اعتراضات غلط ہیں، یہ نظم ساخت اور



مقصد دونوں لحاظ سے بالکل مکمل ہے، کہیں پر بے ربطگی نہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسدس حالی میں ارتقائے خیال فطری نہیں، بلکہ ارادی ہے، یہ لیرک (چھوٹی نظم یا غزل) نہیں کہ ایک خیال فطری طور پر پھول کی طرح کھل پڑے، بڑی نظموں میں ارتقائے خیال ارادی ہوتا ہے، چاہے وہ اوڈ ہو یا ایپک خود ملٹن نے اپنی رزمیہ پاراڈائز لوسٹ کا مقصد بتایا ہے۔

I may ssert eternal Previdence

And justify the ways of God te men "

جہاں مقصد ہو گا وہاں ارادے کا دخل ہونا لازمی ہے، پروفیسر کلیم الدین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن چونکہ انھیں مسدس حالی میں خامیاں نکالنی تھیں، اس لیے کیٹس کے اس مفروضہ کا سہارا لیا کہ اشعار شاخوں میں پتوں کی طرح آنے چاہئیں، خود کیٹس کے شعری مسودے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک ایک سطر کو کئی بار کاٹا ہے، کیا یہ ارادی عمل نہیں؟ کیٹس نے ملٹن کے طرز پر ایک رزمیہ ہائپیرین لکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، اس نے اسے یہ کہہ کر نامکمل چھوڑ دیا کہ میں اسے تسلسل استدلال کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، حیات کو پیش کرنے والا شاعر بڑی نظم تسلسل استدلال اور ارادے کے ساتھ کیسے کہہ سکتا تھا، پروفیسر کلیم الدین اپنی کتاب

Psyeho-Analysis and Literery Criticism

میں خود لکھتے ہیں کہ شاعری ایک شعوری عمل ہے، انھوں نے انکار کیا ہے، کہ کالرج نے نیم غنودگی کے عالم میں کبلا خاں نظم کہی تھی، اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ شاعری میں مضامین پھول کی طرح کھلتے ہیں، تو ہمیں سے

Careless and thoughtless manner

کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، شاعری میں آمد کا یہ مطلب کبھی نہیں کہ انھیں جیوں کا تیوں چھوڑ دیا جائے یا ان سے لاپرواہی برتی جائے، شاعری کرنے میں اس کو سنوارنے کی کوشش بھی اس میں شامل ہے، فن بہرحال دست ہنر کا مرہون منت ہے، عظیم شاعری اور اس کے لیے موزوں زبان مشقت طلب ہیں

ڈانٹے کہتا ہے :۔

"Poetry and the language proper fer it are an elsberate and painful teil."

بڑی نظم کی ساخت ایک عمارت ہی کی طرح ہوتی ہے، اسے پھول کے کھلنے سے تشبیہ نہیں دے سکتے، بڑی نظم کی تشکیل عمارت ہی کی طرح کی جاتی ہے، جس طرح ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر عمارت کی تعمیر کی جاتی ہے، اسی طرح بڑی نظم کو تشکیل و ترتیب دے کر مکمل کیا جاتا ہے، حالی نے بھی مسدس میں اسی فن کو اپنایا، تاج محل سے کسی نظم کو تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ مسدس حالی ہے، مسدس حالی بھی تاج محل ہی کی طرح بالکل متناسب اور مکمل ہے،

آئیے اس کا جائزہ لیں، پروفیسر کلیم الدین احمد نے مسدس حالی سے چند بند لئے، اور انکی ترتیب بدل دی اور کہا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن ترتیب بدل دینے سے جو نقص اور بے ربطگی پیدا ہوگئی، اس پر انھوں نے غور و خوض نہیں کیا، مسدس حالی کے چند بند :۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا



وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

کلیم الدین احمد نے ان کی ترتیب یوں بدل دی اور کہا۔ اسے یوں بھی پڑھ سکتے ہیں :۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

پروفیسر کلیم الدین نے مسدس حالی کے مذکورہ بندوں اور بیتوں کی ترتیب بدل کر حالی جیسے عظیم شاعر اور فن کار کا منہ چڑھایا ہے، اور اپنی عملی تنقید کا بھونڈا نمونہ پیش کیا ہے، حالی شاعر ہیں، ایک اچھے شاعر کے ساتھ وہ فن کار بھی ہیں، اور ایک اچھے فن کار کے ساتھ ایک اچھے مصور بھی ہیں، وہ عظیم شاعری کرتے ہیں اور اُسے سنوارتے بھی ہیں، اس کی نوک پلک بھی درست کرتے ہیں، اور اُسے حُسن ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب مصرعوں اور بندوں کی ترتیب، ربط و تسلسل کو استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تسلسل استدلال اگر دیکھنا ہو تو مسدس حالی میں دیکھئے، یہاں صرف وہی بند زیر بحث آئیں گے، جن کی ترتیب اور ترکیب پروفیسر کلیم الدین نے بدل کر ربط و تسلسل کا شیرازہ بکھیر دیا ہے،

حالی نے لفظ "چلن" سے شروع کیا اور "یونہی" سے ختم کیا، گویا وحشیانہ چلن کے سبب تکرار و تلوار کا سلسلہ یونہی چلتا رہتا تھا، حالی نے پہلے بند میں جھگڑوں کا سبب یہ بتلایا۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ

اور پھر اسکے بعد ہر مصرع میں ہر بیت اور ہر بند میں ان کے وحشیانہ چلن کے سبب جھگڑوں کی تفصیل ترتیب وار تسلسل استدلال کے ساتھ بیان کی اور آخر میں کہا۔

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں



مسدس میں حالی کی ترتیب ایک اعلیٰ فن کی ترتیب ہے، جسے ایک بد خود غلط قسم کے ناقد نے "بے ترتیب" کر کے اس کا مذاق اڑایا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین کے بیتوں اور بندوں کی ترتیب بدل دینے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جھگڑا بلاوجہ ہوتا تھا۔ مثلاً ان کے پہلے بند کا پہلا شعر لیجئے:۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

کسی نے مویشی چرایا اور کسی نے گھوڑا بڑھایا، تو اس میں جھگڑنے کی کیا بات تھی؛ پروفیسر کلیم الدین کی ترتیب سے اسکی وجہ معلوم نہیں کی جا سکتی۔ اب مصرعوں کی ترتیب کو لیجئے، حالی کہتے ہیں۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

اس شعر میں ضمیر "انھوں" کے اسم بکر اور تغلب موجود ہیں، لیکن پروفیسر کلیم الدین کی ترتیب بدل دینے سے شعر بے ربط ہو گیا ہے:۔

تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

کیونکہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں ضمیر "انھوں" سے اسم پہلے مصرع میں نہیں ہے، حالی کے یہاں ایسی خامی نہیں پائی جاتی۔ پھر دوسرے شعر کی ترتیب بھی حالی کے یہاں تسلسل استدلال کے ساتھ ہے۔ حالی کہتے ہیں:۔

قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

بکر اور تغلب کی باہم لڑائی نے نہ صرف قبیلوں کی صفائی کر دی تھی، بلکہ ہر سو عرب میں آگ لگا دی تھی، قبیلوں کے بعد ہر سو عرب کی ترکیب اور ترتیب زیادہ صحیح اور منطقی ہے، اور اس سے ربط و تسلسل بھی قائم رہتا ہے، یہ اہم نکتہ پروفیسر کلیم الدین کی بے ترتیبی سے مجروح ہوتا ہے۔ حالی کا ایک اور بند جو "سلجھتے نہ تھے" ..... سے شروع ہو کر ..... "ملک سارا" پر ختم ہوتا ہے، بالکل درست ہے۔ جو جناب کلیم الدین کی بے ترتیبی سے واقعی بگڑ جاتا ہے۔ حالی کہتے ہیں:۔

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے۔ تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا

تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

آخری شعر پہلے والے شعر میں جو بات کہی گئی ہے اسے بڑے تناظر میں پیش کرتا ہے، یہ ہے حسن ترتیب اور تسلسل استدلال جو کلیم الدین کے ترتیب بدل دینے سے بگڑ گئے تھے۔

ایک اور بند کو لیجئے پروفیسر کلیم الدین ترتیب بدل کر لکھتے ہیں:۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا

یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

اس بند میں بھی ترتیب کی تبدیلی سے کئی نقص ناگوار پیدا ہو گئے ہیں، ربط و تسلسل تو بالکل ختم ہو گیا ہے، یہ پروفیسر کلیم الدین کے ترتیب شدہ بندوں میں پہلا بند ہے، اگر پروفیسر کلیم الدین کی اس ترتیب کو تسلیم کر لیا جائے تو مویشی چرانے، پہلے گھوڑا بڑھانے، پانی پینے پلانے پہ جھگڑا کیوں ہوتا تھا، تلوار کیوں چلتی تھی؟ ان کی وجہیں نہیں معلوم ہوتیں، جب کہ حالی کی ترتیب سے اسکا اندازہ



بخوبی ہو جاتا ہے۔ حالی نے اپنے پہلے ہی بند میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ سارے جھگڑوں کی جڑ ان کا "وحشیانہ چلن" تھا، اب مصرعوں اور بیتوں کو لیجئے:۔ حالی نے مصرعوں کی ترتیب یوں رکھی:

لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

پروفیسر کلیم الدین نے اس کی ترتیب بدل کر یوں کر دیا:۔

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا

حالی کے مصرعوں کی ترتیب بالکل درست ہے جب کہ پروفیسر کلیم الدین کی بالکل غلط ہے، کیونکہ آدمی پہلے لب جو جاتا ہے، تب "پانی پینے پلانے" پہ جھگڑا ہو سکتا ہے، کلیم الدین کی ترتیب سے تو پتہ چلتا ہے کہ لب جو جانے سے پہلے ہی پانی پینے پلانے پہ جھگڑا ہو گیا۔

اور یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے، ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

ایک باریک نکتہ اور بیان کرتا چلوں اس سے پروفیسر کلیم الدین کی ترتیب کی خامی اور بے ربطگی بالکل واضح ہو جائے گی، حالی نے بند کے آخر شعر کی ترتیب یوں رکھی تھی،

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

پروفیسر کلیم الدین نے اس کی ترتیب بدل کر اسے یوں بے ربط کر دیا۔

یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

حالی کی ترتیب منطقی ہے، پہلے تکرار ہوتی ہے، تب تلوار چلتی ہے، لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد نے پہلے ہی تلوار چلا دی، جب تلوار چل گئی تو تکرار کی گنجائش کہاں؟

اس طرح ہم نے دیکھا کہ پروفیسر کلیم الدین نے مسدس حالی کے بندوں، بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب بدل کر ان کے ربط و تسلسل کو بالکل ختم کر دیا تھا، ورنہ مسدس حالی کے ہر بند، ہر بیت اور ان کے مصرعوں میں ربط و تسلسل ہے اور تسلسل استدلال کے ساتھ۔

مسدس حالی کی عمارت کی ساری اینٹیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، دیواریں بالکل سیدھی ہیں، مینار و سقف میں بھی تناسب ہے، اسکے ہر دو ٹکڑوں میں بھی، دو مصرعوں، دو بیتوں، دو بندوں میں وہ ربط و تسلسل ہے، جو ہونا چاہئے۔

# مطبوعاتِ جدیدہ

**جدید دنیا میں اسلام، مسائل اور امکانات** — مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۲۸۔ قیمت ۴۰ روپیہ۔ پتے: (۱) اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی۔

پندرھویں صدی ہجری کی مناسبت سے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر نے جدید دور میں اسلام، مسائل اور امکانات کے موضوع پر ایک سمینار منعقد کیا تھا، جس میں اردو اور انگریزی میں مفید اور بلند پایہ مضامین پڑھے گئے تھے، یہ کتاب اس سمینار کے اردو مضامین پر مشتمل ہے، ان مضامین میں ان مسائل و مشکلات کا ذکر ہے، جو موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانانِ عالم کو درپیش ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ اسلام ان مسائل میں بھی مکمل رہنمائی کر سکتا ہے، اور وہ نئی ضرورتوں، تقاضوں اور حالات سے عہدہ برآ ہونے کی اپنے اندر پوری صلاحیت بھی رکھتا ہے، عقائد، عبادات، اخلاق اور بعض بنیادی اقدار و مسائل کے بارہ میں گو اسکی تعلیمات و ہدایات ابدی اور ناقابلِ ترمیم و تغیر ہیں، گو وہ پہلے ہی کی طرح آج بھی مفید، موثر اور معنی خیز ہیں، اور جو نئے معاشرتی، تمدنی و سیاسی مسائل مخصوص ماحول، عہد اور حالات کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں، ان کے بارہ میں اسلامی احکام میں لچک ہے، اور وہ اجماع، قیاس اور اجتہاد وغیرہ کے ذریعہ حل کئے جا سکتے ہیں، اس سلسلہ میں گذشتہ اسلامی تاریخ خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے اجتہادات سے بڑی رہنمائی ملتی ہے، اس ضمن میں اسلام کی ان خصوصیات اور خوبیوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی فلاح و ترقی اور دنیا کے امن و امان کا ضامن ہے، اور وہی معاشرت، معیشت اور تمدن کا ایک متوازن اور عادلانہ نظام اور فلاحی حکومت عطا کر سکتا ہے، اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ



موجودہ دور میں اسلام کی اشاعت کے لیے کیا امکانات پیدا ہو رہے ہیں، اور بعض مسلم ملکوں میں اس کے احیار و فروغ کے لیے کیا جد و جہد کی جا رہی ہے، چند مضامین کے عنوانات سے کتاب کی نوعیت و اہمیت کا پتہ چلے گا۔ جدید دنیا میں اسلام، مسائل اور امکانات (پروفیسر آل احمد سرور) عصرِ حاضر کے ساتھ اسلامی اقدار اور تعلیمات کی مطابقت (میر واعظ مولانا محمد فاروق) دورِ حاضر میں اسلامی اقدار کی معنویت (جناب غلام رسول ملک) ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت (مولانا مجیب اللہ ندوی) شریعت بدلتے ہوئے زمانے میں حضرت عمر فاروقؓ کے اجتہادات کی روشنی میں (مولانا سعید احمد اکبر آبادی) حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے اجتہادات سے ہم کو کیا ملا اور کیا مل سکتا ہے (جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب) غزالی کا اجتہاد (جناب رشید نازکی) اسلام اور سیکولرازم (جناب مفتی محمد رضا انصاری) فکرِ اقبال اور ہندی مسلمان (پروفیسر مسعود حسین خان) اصلاح و تجدد کے حامی اور ان کی الجھنیں (پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی) جمہوریۂ اسلامی ایران میں اسلام کے مسائل اور امکانات (ڈاکٹر کبیر احمد جائسی) ہندوستانی سیکولر جمہوریہ میں اسلامی قانون کی مناسبت (جناب غلام نبی باگرو) مسلم ممالک میں اسلامی قانون کا نفاذ اور اس کا جواز (جناب ایم۔ اے شیدا) اسلام اور بینکنگ (جناب ریحان الحق) آخری مضمون میں سود کی حرمت اور بینک کے انٹرسٹ کو بھی سود ہی کی قسم قرار دینے کے باوجود موجودہ زمانہ میں بینکنگ کا ناگزیر ہونا بھی بتایا ہے، اور اسے سود کے بغیر چلانے کے بعض تجربوں کی نشاندہی کی ہے، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے مضمون کے آخر میں بھی سود کے تعلق سے بعض قابلِ غور باتوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، جناب غلام رسول ملک نے اچھے انداز میں اسکی وضاحت کی ہے کہ اسلامی اقدار موجودہ زمانہ میں بھی بڑی مفید اور پر معنی ہیں، خود فاضل مرتب کا مقالہ بھی قابلِ ذکر ہے، شروع میں اس زمانہ کے کشمیر کے وزیرِ اعظم جناب شیخ عبد اللہ مرحوم کا خطبہ افتتاحیہ درج ہے، گو سب مضامین ایک سطح کے نہیں ہیں، اور بعض کے مندرجات بھی محلِ نظر ہیں، تاہم اکثر مضامین سنجیدہ ہیں جو اصحابِ علم کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں۔

**ایام خلافت راشدہ:** مرتبہ مولانا عبد الرؤف رحمانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ بہتر،

صفحات ۴۰۰ مجلد مع گردپوش، قیمت تیس روپیے (۳۰ روپے) پتہ:- جامعہ سراج العلوم السلفیہ جھنڈا نگر (نیپال)

خلفائے راشدینؓ کی حکومت بے مثال تھی، اس کتاب میں انکے سراپا خیر و برکت دور کے امن و امان، خوشحالی، فارغ البالی اور عدل و انصاف کی جھلک دکھائی گئی ہے، اور انکی رعایا پروری اور خلق خدا کی خدمت اور نفع رسانی کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، سب سے پہلے مصنف نے خلفائے راشدین کی امانت و دیانت کا تذکرہ کیا ہے اور قوم کے مال میں انکی احتیاط اور کسی قسم کی خیانت اور خورد برد کرنے کے متعدد حیرت انگیز واقعات تحریر کئے ہیں، ان کی سادہ اور درویشانہ زندگی کے سلسلہ میں طعام، لباس اور رہن سہن وغیرہ میں انکی سادگی اور قناعت پسندی دکھائی ہے اور عام لوگوں کے ساتھ انکے حسن سلوک اور مساویانہ برتاؤ کی تفصیل بھی پیش کی ہے، اور زمین کی آبادکاری اور رفاہ عام کے مختلف کاموں کے علاوہ مسکینوں، یتیموں، بیوہ عورتوں اور بے سہارا لوگوں، نیز غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حال بیان کیا ہے، افلاس اور بے روزگاری کے خاتمہ اور سماجی و معاشی ناہمواری کو درست کرنے کے لئے انکی تدبیروں اور کوششوں کا ذکر ہے، عہدوں پر مناسب اور باصلاحیت لوگوں کے تقرر اور عمال کی نگرانی و احتساب اور ان کے خلاف دادرسی وغیرہ کے واقعات بھی پیش کئے ہیں، اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے دور کے واقعات بکثرت بیان کئے گئے ہیں، دوسرے خلفائے راشدینؓ کے علاوہ کہیں کہیں بعض عباسی خلفا کی رعایا پروری اور انصاف پسندی کا ذکر بھی آگیا ہے، اور جن پہلوؤں پر بحث کی ہے، انکے متعلق پہلے اسلام کی عام ہدایات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی پیش کی ہیں، اس کے بعد خلفائے راشدینؓ کی زندگی سے اس کی مثالیں اور عملی نمونے دئے ہیں، اور ضمناً ان امور کے بارہ میں موجودہ دور کی حکومتوں کے غلط رویے کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا گیا ہے، اردو میں خلفائے راشدینؓ کے حالات اور اسلامی نظام پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس کتاب میں خلفائے راشدینؓ کی رعایا پروری اور انکے فلاحی کاموں کو یکجا کر دیا گیا ہے، زبان و بیان کی خامی کا اعتراف مصنف کو خود ہے، اسکے علاوہ اس میں ربط و تسلسل کی کمی اور ناہمواری بھی ہے، مختلف مباحث ایک دوسرے سے مختلط ہو گئے ہیں، تحریر میں الجھاؤ اور پھیلاؤ بھی ہے، کہیں کہیں حوالے درج نہیں ہیں، اور بعض کم درجہ کے حوالے بھی درج ہیں۔

"ض"

جلد ۱۳۵ ماہ جمادی الاخری ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۵ء عدد ۳

## مضامین



---

## سلسلہ اسلام اور مستشرقین

### جلد اوّل

دارالمصنفین میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اوسکی پہلی جلد مرتب ہو کر چھپ گئی ہے، یہ فروری ۸۲ء میں اس موضوع پر جو سمینار ہوا تھا، اسکی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد ہے۔

"منیجر"